BUDC-133

اردو زبان کا آغاز وارتقا

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینٹیز

بلاک

2

اردو زبان کا آغاز وارتقا

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 7
اردو زبان کے اولین نقوش اور دکنی اردو 93

اکائی 8
شمالی ہند میں اردو نثر اور شاعری کا ارتقا 105

اکائی 9
دہلی میں اصلاحِ زبان کی کوشش ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک۔
مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات، دیوان زادہ کے دیباچے کی تاریخی ولسانی اہمیت 125

اکائی 10
لکھنؤ میں اصلاحِ زبان کا عمل۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں کی کاوشیں 141

اکائی 11
اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب اور موجودہ صورتِ حال 151

بلاک 2 تعارف

''اردو زبان کا آغاز وارتقا'' اس کورس کے دوسرے بلاک میں کُل 5 اکائیاں ہیں۔

اکائی 7: 'اردو زبان کے اولین نقوش اور دکنی اردو'۔ اس اکائی میں اردو زبان کے اولین نقوش اور دکنی اردو کا بیان ہے۔

اکائی 8: 'شمالی ہند میں اردو نثر اور شاعری کا ارتقا'۔ اس اکائی میں ہم شمالی ہند میں اردو نثر اور شاعری کے ارتقا کی تفصیلی جانکاری حاصل کریں گے۔

اکائی 9: 'دہلی میں اصلاحِ زبان کی کوشش (ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک - مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات، دیوان زادہ کے دیباچے کی تاریخی ولسانی اہمیت)'۔ اس اکائی میں اصلاحِ زبان کی تحریک کے مقاصد، ایہام گوئی، ترکِ ایہام گوئی کے رجحان واسباب کی جانکاری حاصل کرنے کے ساتھ ہی مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات کی تفصیلی جانکاری دی گئی ہے۔

اکائی 10: 'لکھنو میں اصلاحِ زبان کا عمل ناسخ اور ان کے شاگردوں کی کاوشیں'۔ اس اکائی میں لکھنو میں ناسخ اور ان کے شاگردوں کی اصلاح زبان کی کوششوں کے ساتھ ہی اردو زبان کی بدلتی شکل کی بھی تفصیلی جانکاری حاصل کریں گے۔

اکائی 11: 'اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب اور موجودہ صورتِ حال'۔ اس اکائی میں ہم اردو زبان کی مقبولیت کے وجوہات اور آج کے دور میں اس کی صورتِ حال کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

اکائی 7 اردو زبان کے اولین نقوش اور دکنی اردو

ساخت :

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 دکن کی تعریف

7.4 دکن میں اردو

7.5 صوفیائے کرام اور اردو

7.6 فاتحین کا کردار

7.7 آپ نے کیا سیکھا

7.8 اپنا امتحان خود لیجیے

7.9 سوالات کے جوابات

7.10 فرہنگ

7.11 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ

- علاقہ دکن کیا ہے
- دکن میں اردو کی ابتدا کیسے ہوئی
- دکن میں اردو کی ابتدا میں صوفیائے کرام کا کردار کیا رہا ہے
- دکن میں اردو شاعری کے اولین نقوش کیا ہیں
- دکن میں اردو نثر کے ابتدائی نمونے کس طرح ملتے ہیں

7.2 تمہید

بھارت کا جنوبی حصہ جو کوہ وندھیا چل اور ست پُڑا کی پہاڑیوں کے جنوب میں واقع ہے دکن کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ سیاسی، سماجی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان کے آغاز کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ دکن میں اس کی ابتدا سے متعلق بھی ہے۔ اس علاقے کی اردو کو عموماً دکنی یا دکھنی اردو کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے ابتدائی ادب پارے چاہے وہ شعری ہوں کہ نثری دکنی اردو ہی میں پائے جاتے ہیں۔ اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات کی موجودگی میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اردو کا آغاز دکن میں ہوا۔ لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اردو کو ادبی زبان کا

درجہ دکن ہی میں حاصل ہوا۔ محبت اور امن کا پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے صوفیاء کو ایک عوامی زبان کی ضرورت تھی۔ اردو یا دکنی نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو میں علاقائی زبان کے الفاظ بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ دکن میں اردو زبان وادب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور اردو کی پہلی نثری کتاب ہمیں دکن سے ملتی ہے۔

7.3 دکن کی تعریف

کوہ وندھیا چل کا جنوبی علاقہ دکن کہلاتا ہے۔ قدیم بھارت میں یہ علاقہ بے حد سیاسی، سماجی وتاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ بھارت پر حملہ آور اقوام کے قافلے ایک عرصے تک کوہ بندھیا چل کے شمالی علاقے تک ہی محدود رہے۔ ایک طرح سے کوہ وندھیا چل شمال اور جنوب کے درمیان ایک قدرتی سرحد کا کام کرتا رہا۔ دکن کا علاقہ علمی وتہذیبی سطح پر مالا مال ایک پرامن علاقہ رہا ہے۔ ایک جانب ایلورہ واجنتا کی شکل میں قدیم انسانی تہذیب کی انگڑائیاں نقش ہیں تو دوسری جانب جگہ جگہ بکھرے منادر، مساجد اور دیگر عمارات ماضی کی عظمتوں اور خوش حالیوں کی داستاں زبان حال سے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ معلوم سیاسی تاریخ کے لحاظ سے دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر دوسری صدی عیسوی تک یہاں عظیم ساتواہن راجاؤں کی حکمرانی رہی ہے جن کا صدر مقام پرتشٹھان یعنی موجودہ پٹن تھا۔ ایک صدر مقام ہونے سے کہیں زیادہ پٹن کی اصل شہرت ایک مرکز علم وفن کے طور پر تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومتیں تو بدلتی رہیں لیکن یہ علاقہ ہمیشہ پرسکون رہا۔ ساتواہن کے بعد چالوکیہ راجاؤں نے پڑوسی ریاست کرناٹک سے یہاں آکر حکومت کی۔ پھر ایک اور مضبوط مقامی حکومت کے طور پر راشٹرکوٹ حکمراں ابھرے جن کی راجدھانی پہلے لاتور اور پھر قندھار رہی۔ راشٹر کوٹ اقتدار بھی تقریباً دوسو برس رہا۔ اس دوران قندھار بھی ایک علمی، ادبی، تہذیبی وفنی مرکز کے طور پر ابھرا۔ جس کے آثار آج بھی تاریخ کے صفحات اور قندھار کے چپے چپے پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اس علاقے کے تیسرے اور اہم حکمراں یادو راجا تھے۔ جنہوں نے ایک طویل عرصے تک حکمرانی کی اور جن کی راجدھانی دیوگیر (دولت آباد) تھی۔ یادو حکمرانوں کے عہد میں یعنی بارہویں و تیرھویں صدی عیسوی میں اس علاقے کی خوشحالی اور دولت مندی کے چرچوں نے دہلی کے حکمرانوں کے کان کھڑے کردیے تھے جس کے نتیجہ میں 1296 میں علاؤالدین خلجی دکن پر حملہ آور ہوا۔

بھارت میں زبانوں کے دو اہم خاندان پائے جاتے ہیں۔ جنہیں ہم ہندآریائی زبانوں کا خاندان اور دراوڑی زبانوں کے خاندان کے طور پر جانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دراوڑی نسل کے لوگ ہی قدیم بھارت کے اصل باشندے ہیں۔ حملہ آور اقوام کے بڑھتے اثر ورسوخ نے انھیں جنوب میں سمٹ جانے پر مجبور کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ دراوڑ خاندان سے متعلق ساری زبانیں جنوبی ہند ہی میں بولی جاتی ہیں۔ دراوڑ زبانوں کی طرح ہندآریائی زبانیں بھی بھارت ہی میں پیدا ہوئیں۔ دسویں اور بارہویں صدی کے دوران مقامی پراکرتوں کے میل جول سے جدید ہندآریائی زبانیں وجود میں آئیں۔ اردو

بھی ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔اس کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات ہیں اور ماہرین لسانیات کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہیں۔لیکن سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ اردو اسی عرصے میں ایک جدید ہند آریائی زبان کے طور پر بھارت میں پیدا ہوئی۔دسویں صدی عیسوی میں مہاراشٹر میں مہاراشٹری پراکرت رائج تھی۔اسی کے بطن سے آگے چل کر مراٹھی زبان پیدا ہوئی۔یہی عرصہ دکن میں صوفیائے کرام کی آمد کا عرصہ بھی ہے۔اپنے پیغام امن ومحبت کو عوام تک پہنچانے کے لئے انھیں ایک عوامی زبان کی ضرورت تھی۔ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔صوفیائے کرام کا یہی جذبہ ایک نئی زبان کے فروغ کا باعث بنا جسے دکنی ، ہندوی یا اردوئے قدیم کہا گیا۔اس زبان کے ابتدائی نقوش ہمیں صوفیائے کرام کی گفتگو اور رسالوں میں ملتے ہیں۔

7.4 دکن میں اردو

دکن شروع ہی سے تہذیبی ولسانی سطح پر انتہائی زرخیزی کا حامل رہا ہے۔یہ علاقہ ایک کثیر لسانی علاقہ ہے جہاں مراٹھی کے علاوہ کنڑ ،تمل،ملیالم زبانیں بھی رائج ہیں۔ان زبانوں میں سے کنڑ ،تمل،ملیالم دراوڑ خاندان کی زبانیں ہیں لیکن مراٹھی ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔دسویں سے بارھویں صدی کے درمیان کا عرصہ ہندوستان میں جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز وارتقا کا زمانہ ہے۔اسی دور میں اس علاقہ میں ایک جدید ہند آریائی زبان کے طور پر مراٹھی کا آغاز ہوا وہیں تیرھویں صدی عیسوی میں دکنی/ہندوی یا آج کی اردو زبان کا آغاز وارتقا بھی اسی زمین پر ہوا۔

اردو کے تمام مشاہیر دکن سے اردو کے رابطے کی پہلی کڑی علاؤالدین خلجی کے حملے 1296 کو قرار دیتے ہیں جب کہ خلجی کے حملے سے دو سال قبل ہی 1294 میں گیا نیشور سمادھی لے چکے تھے وہی گیا نیشور جو کہتے ہیں کہ ؎

سب گھٹ دیکھو مانک مولا کیسے کہوں میں کالا دھولا
پنچ رنگ سے نیارا کوئی لینا ایک اور دینا دوئی

اسی عہد کا ایک اہم شاعر نامدیو کہتا ہے کہ

مائی نہ ہوتی باپ نہ ہوتا کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آیا

یہ زبان انتہائی صاف وشفاف زبان ہے اور برج بھاشا، کھڑی بولی ، پنجابی یا دکنی سے ہر طرح سے مختلف زبان بھی ہے۔لسانیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس زبان پر کسی زبان کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں تو وہ مراٹھی کے اثرات ہیں۔یہ وہی زبان ہے جو مراٹھواڑہ میں خلجی وتغلق کے حملوں سے قبل ادب کا حصہ بن چکی تھی۔خلجی وتغلق کی مراٹھواڑہ آمد سے قبل بھی یہاں اسلامی تہذیب کے اثرات پہنچ چکے تھے،سنت گیا نیشور اور سنت نامدیو تیرتھ یاترا کی غرض سے شمالی ہند کا سفر کر چکے تھے اس طرح

پنجابی کے ساتھ ساتھ کئی جدید ہند آریائی زبانوں کے رابطے میں بھی آ چکے تھے۔ خلجی وتغلق سے قبل جنوبی ہند کے علاقوں میں کئی صوفیائے کرام کی آمد کے دستاویزی ثبوت بھی ملتے ہیں۔

جسے آج ہم اردو کہتے ہیں اس زبان کو انیسویں صدی کے اختتام تک کئی ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ اسے کبھی ہندی، ہندوی، ہندوستانی، گجری، دکنی اور مسلمانی کہا گیا تو کبھی زبان اردوئے معلّٰی، زبان اردوئے شاہی، محاورۂ شاہجہاں آباد اور ریختہ بھی کہا گیا۔ پہلی بار مصحفی نے اسے ''اردو زبان'' نام دیا۔ دکن میں بھی ابتدا میں اسے ہندی، ہندوی یا ہندوستانی ہی کہا گیا۔ لیکن بہمنی عہد میں اسے دکنی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ علاقہ دکن دراصل ایک جغرافیائی وسیاسی اکائی کا نام ہے۔ سیاسی سطح پر اسے وہ علاقہ کہا جاسکتا ہے جہاں مغلیہ حکومت کی سرحدیں ختم ہوتی تھیں۔ جغرافیائی سطح پر اسے کوہ وندھیاچل سے جنوب کی جانب کا نچلا علاقہ کہا جاسکتا ہے جبکہ لسانی سطح پر اسے ہند آریائی زبانوں کا سرحدی علاقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ جس کے آگے دراوڑ خاندان کی زبانوں کی عمل داری کا آغاز ہوتا ہے۔ اک عرصے تک یہ علاقہ شمالی ہند کے حکمرانوں کی دسترس سے باہر رہا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں علاؤالدین خلجی نے پہلی بار اس علاقے کا رخ کیا اور اس کے فوری بعد چودھویں عیسوی کے اوائل میں محمد بن تغلق نے دولت آباد کو صدر مقام بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ یہی دو واقعات دکن میں اردو کے آغاز وارتقاء کا سبب بنے لیکن دکن میں اردو کے آغاز ورتقاء میں صوفیوں اور سنتوں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

7.5 صوفیائے کرام اور اردو

دکن کا پہلا فاتح علاء الدین خلجی 1296 میں دیوگیری پہنچا لیکن اس سے قبل ہی دکن اور بالخصوص مراٹھواڑہ میں متعدد صوفیائے کرام مختلف مقامات پر پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کی معلومات ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ان میں حضرت سید حسینؒ (وفات 1188)، حضرت سید علاؤ الدینؒ (وفات 1253) اور سید حسام الدین تیغ برہنہؒ (وفات 1281) شامل ہیں۔ ''عوارف المعارف'' کے مصنف سہروردیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (وفات 1234) کے مرید حضرت بابا فرید شرف الدین عراقیؒ بھی ایسی ہی ایک مثال ہیں جن کا مزار حیدرآباد کے جنوب میں ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ دولت آباد، خلد آباد اور اورنگ آباد کے تمام صوفیائے کرام کا تذکرہ کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے لیکن حضرت مومن عارف باللہؒ دولت آباد کا تذکرہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علاؤالدین خلجی کی آمد سے بہت پہلے دیوگیری (دولت آباد) تشریف لا چکے تھے۔ دولت آباد کے راجا رام دیو کی ایک بیٹی آپ کی مرید تھی جس کا مزار آپ کے روضے سے ملحق ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس وقت دیوگیری اور اطراف میں آپکے ارادت مندوں کا ایک وسیع حلقہ بھی موجود تھا۔

718ھ تا1318ء میں ہمیں حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی محفلوں میں دکن بالخصوص دیوگیری کا ذکر ملتا ہے۔ جب حضرت نظام الدینؒ دیوگیری میں موجود اپنے ایک ارادت مند کی جانب سے ایک باندی کو آزاد کئے جانے کے واقعہ کی ستائش کرتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے دو مریدوں خواجہ عزیز الدین اور شیخ زادہ کمال الدین کو تبلیغ دین کے مقصد سے مالوہ اور دکن کے لئے روانہ کیا تھا۔ یہ دونوں حضرات حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے پوتے تھے۔

سرزمین دکن پر صوفیاء کرام کو اپنی تعلیمات کے فروغ کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی۔ رابطہ اور ترسیل کی ایسی کوئی زبان موجود نہیں تھی جو ان کا مقصد پورا کر سکے۔ عوام سے رابطے کی شدید خواہش نے انھیں ایک ایسی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کیا جو کئی زبانوں کا مجموعہ تھی۔ صوفیائے کرام کی زبان ہی وہ زبان ہے جس میں اردو کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ محمد بن تغلق کے عہد میں دولت آباد پہنچنے والے بزرگوں میں سے بیشتر نے اپنی تعلیمات کے فروغ کے لئے اردو کا استعمال کیا۔ شاہ برہان الدین غریبؒ اور زین الدین خلد آبادیؒ کے علاوہ یوسف حسینی عرف سید راجہؒ اور امیر حسن سنجریؒ نے بھی اردو کا استعمال کیا۔ بقول عبدالقادر سروری :

> ''محمد تغلق کے حکم سے جو بزرگ دولت آباد آئے تھے ان میں سے اکثر خلد آباد چلے گئے تھے۔ جہاں انھوں نے تبلیغ، ارشاد اور ہدایت کا کام جاری رکھا۔ ان میں امیر حسن اعلائے سنجری جیسے فارسی کے سربرآوردہ شاعر بھی تھے۔ جن کا کچھ اردو کلام ریختہ کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے۔ حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ اور ان کے ارادت مندوں میں شیخ زین الدین اور ساتھیوں میں حضرت یوسف حسینی عرف سید راجا بادشاہ راجو کے کچھ اردو کے اشعار مل جاتے ہیں۔''

امیر خسرو کے ہمعصر امیر حسن سنجری نے بھی اسی عہد میں سرزمین مراٹھواڑہ پر فارسی آمیز غزل کہی۔ یہ فارسی آمیز غزل فارسی و مقامی اثرات کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ یہ غزل حیرت انگیز طور پر خسرو کی غزل کے مقابلے عام فہم بھی ہے۔

ہر لحظ آید درد لم دیکھوں اوسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیولائے کر

مختلف صوفیائے کرام کے رسائل کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن آج ان رسائل تک رسائی ناممکن ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر دست بُرد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے :

> ''حضرت عین الدین گنج العلمؒ جو اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے اور علاؤ الدین کی تخت نشینی کے وقت دولت آباد میں موجود تھے۔ بعد میں بیجاپور چلے گئے تھے۔ جہاں انھوں نے اِرشاد و ہدایت کا کام جاری رکھا۔ انہوں نے دکھنی عوام کی اصلاح کے لیے کچھ رسالے پرانی اردو میں بھی لکھے تھے۔ حضرت عین الدینؒ کا انتقال محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ہوا۔''

یہی پرانی اردو دراصل صوفیائے کرام کی زبان تھی۔ اسی کی مدد سے ان شاہان بے نظیر نے عوام کے دلوں پر حکومت کی یہی وجہ ہے کہ ان صوفیائے کرام کے ملفوظات میں اس بولی کے ایسے خوبصورت جملے دیکھنے کو ملتے ہیں جو وہ عام گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔

''اے برہان الدین ساڈھی دھیہ کہہ کیا پسند اہے''

''منجھ مت بلاؤ''

''نہوے آوے نہوے جائے لالہ کوں تیرے بارے''

''سید محمد اوس نہ پتیائی''

یہی جملے ابتدائی اردو کے قدیم ترین نمونے ہیں جو دکن کی سرزمین پر ملتے ہیں۔

7.6 فاتحین کا کردار

علاؤالدین خلجی کا یہ حملہ دکن کی تاریخ کا ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ یہ حملہ جہاں دو مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ اور بعد ازاں ملن ثابت ہوا وہیں ایک نئی لسانی تہذیب کے ارتقاء کا پیش خیمہ بھی بنا۔ خلجی نے گویا شمال والوں پر دکن کے دروازے کھول دیے یہاں سے دکن کی سیاسی تاریخ ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ خلجی تو حملے کے فوری بعد دیوگیری کی دولت لوٹ کر اور یہاں کے راجا رام چندر یادو کو اپنا باجگزار بنا کر دہلی لوٹ گیا لیکن اس نے پختہ سیاسی انتظامیہ کے طور پر ہر سو گاؤں پر ایک امیر کا تقرر کیا جو حکومت دہلی کے سیاسی نمائندوں کے طور پر کام کرتے تھے۔

ان امیران صدہ نے انتہائی سرعت سے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔ علاؤالدین خلجی کے بعد محمد تغلق دہلی کا دوسرا حکمراں تھا جس نے جنوب کا رخ کیا۔ چودھویں صدی کی تیسری دہائی میں اس نے اپنی راجدھانی دہلی سے دیوگیری منتقل کی۔ اور دیوگیری کو دولت آباد کا نام دیا۔ جلد ہی تغلق کو اپنے منصوبے کے ناقابل عمل ہونے کا احساس ہوگیا اور وہ بھی خلجی ہی کی طرح فوری دہلی واپس چلا گیا۔ تغلق کے دہلی لوٹتے ہی امیران صدہ جو یہاں کے سیاسی نظام میں اپنی جڑیں گہرائی تک پیوست کر چکے تھے وہ ابھر آئے۔ ان تمام نے مل کر حسن گنگو بہمنی کی قیادت میں سلطنت کی بنیاد دولت آباد میں ڈالی۔ یہی بہمنی سلاطین نسلاً ترک تھے لیکن اپنے آپ کو فخر سے ''دکنی ترک'' کہتے تھے۔ ان بہمن سلطانوں کا معاملہ بالکل اس طرح تھا جیسے کوئی گھر میں داخل ہو کر کواڑ اندر سے بند کرلے۔ یہ اس علاقے کی آب وہوا میں کچھ ایسے رچ بس گئے تھے کہ انھوں نے اسی خاک کا پیوند ہونے کا تہیہ کرلیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ریاست کی اندرونی سیاسی اتھل پتھل اور ٹکراؤ حکومت کے بکھرنے کا باعث نہیں بن سکا۔ بہمنی سلطنت کا قیام 1490 میں عمل میں آیا اور دولت آباد کو اس کی پہلی راجدھانی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن جلد ہی سیاسی وجوہات کی بنیاد پر اس کا صدر مقام گلبرگہ منتقل ہوگیا۔ علاؤالدین حسن بہمنی نے گلبرگہ کو اپنے نام پر حسن آباد کا نام دیا۔ بہمنی حکومت کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے ایک ایسے علاقے کو جو تین مختلف تہذیبوں اور تین مختلف زبانوں کی آماجگاہ تھا ایک ایسی اکائی میں تبدیل کر دیا جو

ایک نئی مشترکہ تہذیب وتمدن اور نئی زبان کی نشو ونما کا باعث بنی۔ اس وسیع تر سلطنت میں مراٹھی، تلگو اور کنڑ علاقے شامل تھے جہاں کی زبان وتہذیب ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ تھی۔ بقول ڈاکٹر محمد علی اثر :

> ''اس نئی حکومت کا بانی ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے دہلی کے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ شمال دشمنی کی وجہ سے وہ ترک ہونے کے باوجود خود کو دکنی کہنا قابل فخر سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئی سلطنت کی بنیاد میں شمالی ہند کے رجحانات وروایات سے انحراف کے جذبات نشو ونما پانے لگے۔ شمالی ہند ایرانی اور عربی کلچر سے متاثر تھا مگر دکن اس سے بڑی حد تک مبرّا تھا۔ بہمنیوں نے سیاسی لائحہ عمل کے طور پر سرزمین دکن کے تعلق سے ان تمام مقامی عناصر کو ابھارا جو شمال سے مختلف تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی زبانوں، رسم ورواج اور رہن سہن کے طور طریقوں، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کی خوب حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔''

بہمنی عہد میں دکن کا بیشتر علاقہ ایک نئے تہذیبی دھاگے میں پرو دیا گیا۔ بہمنی سلاطین کا سیاسی کارنامہ اس وقت ایک تہذیبی ولسانی کارنامہ میں تبدیل ہوگیا جس وقت شمالی ہند میں محض بولی کی حیثیت رکھنے والی ایک زبان یہاں پہنچ کر ادبی وتخلیقی زبان کا درجہ پا گئی۔ اس زبان کو کبھی دکنی تو کبھی ہندوی اور کبھی اردوئے قدیم کہا گیا۔ اس زبان اور اس کے پیغام نے عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا اور سماجی مساوات وانسانی اخوت جیسے عظیم تصورات جو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں اسی زبان میں جنوبی ہند میں بسنے والی اقوام تک پہنچے۔ اس طرح اردو کے ذریعے اس پسماندہ علاقے میں علوم وفنون کی روشنی پھیلی۔ نصیر الدین ہاشمی ''دکن میں اردو'' میں رقمطراز ہیں :

> ''محمد شاہ کے زمانے میں بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، قندھار، دولت آباد، ایلیچ پور وغیرہ میں مدرسے قائم کئے۔ جہاں قابل قابل اساتذہ طلباء کو درس دیا کرتے تھے۔ طلباء کے وظائف جاری تھے۔''

بہمنی سلطنت (1437 سے 1527) دکن میں تقریباً پونے دوسو سال تک قائم رہی۔ اس کے کُل اٹھارہ حکمراں گزرے۔ جنوبی ہند کا بیشتر علاقہ اس کے زیر نگیں رہا۔ شمالی ہند کی مغلیہ حکومت کے سامنے یہ اپنی الگ شناخت بنائے رکھنے میں کامیاب رہی۔ اس دوران یہاں زبان وادب کی ترقی و ترویج کا کام بھی مسلسل جاری رہا۔ اس سلطنت کے اہم ادیب وشعراء میں شیخ عین الدین گنج العلمؒ جن کے کئی رسالوں کا ذکر ملتا ہے۔ ''معراج العاشقین'' کے خالق خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف کو ایک عرصہ تک اردو کی پہلی نثری تصنیف مانا جاتا رہا۔ لیکن بعد کی تحقیق میں یہ ثابت ہوا کہ معراج العاشقین ان کی تصنیف نہیں ہے۔ بہمنی عہد کا ایک اور اہم نام فخر

الدین نظامی ہے جسے نظامی بیدری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ان کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو اردو کی پہلی مثنوی اور پہلی تصنیف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔شاہ میراں جی شمس العشاق بھی اسی بہمنی عہد کے اہم شاعر ونثر نگار ہیں۔اس عہد کا اہم نام شاہ اشرف بیابانی بھی ہے جن کی تصانیف ''لازم المبتدی''، ''واحد باری'' اور ''نوسرہار'' اہمیت رکھتی ہیں۔شاہ اشرف بیابانی کی ''نوسرہار'' سے پتہ چلتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں علاقہ دکن میں اردو ایک ادبی زبان کے طور پر اپنا وجود منوا چکی تھی۔ اوراس میں شعرونثر میں کئی اصناف رائج تھیں۔نوسرہار ہی میں ہمیں غزل کی تعریف اوراس کی تکنیک پر چند اشعار ملتے ہیں۔

بحر ہے دریا آب فراخ — کلام موزوں ہے ڈالی شاخ
نیم بیت کو مصرع بول — دو مصرع کی بیت ہے کھول
رباعی کیا ؟ چو مصرع جان — مخمس کیا ؟ پنج مصرع خوان
چند بیت کو قطعہ تو جان — از شعر و غزل سے کاٹ کے آن
کم از پنج بیت نہ آوے غزل — ہو ذکر فراق محبت مثل
قصیدہ غزل کا اول مطلع — تخلص آخر بیت کا مقطع
ردیف بعد از قافیہ آر — ایک گھوڑے پر دو سوار

تقریباً پونے دوسو سال بعد بہمنی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور اس میں سے دکن میں پانچ خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔یہ پانچوں ریاستیں برید شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی اور عماد شاہی کے نام سے مختلف اوقات میں قائم ہوئیں۔ان سلطنتوں میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں تاریخی کردار ادا کیا۔

عادل شاہی سلطنت بیجاپور میں سن 1490 میں قائم ہوئی۔اس کا قائم کرنے والا ابراہیم عادل شاہ تھا جو خود بھی ایک قادرالکلام شاعر تھا۔اس کا اردو کلام دستیاب ہے۔اس دور کے اہم شعراء میں نصرتی، ہاشمی، رستمی، سید میراں ہاشمی اور حسن شوقی شامل ہیں۔ان میں سے نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' مشہور ہوئیں جبکہ حسن شوقی کو ولی سے قبل اردو غزل کی روایت کا اہم شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کی زبان کی سلاست قابل دید ہے۔

جن یو غزل سنایا جلتیاں کوں پھر جلایا
وہ رند لا ابالی شوقی حسن کہا ں ہے
شوقی کی ہے پیاری ہنس ہنس کے سوناری
افضل غزل تماری جوں سُور ہے گگن میں

اسی عہد میں غزل کے حوالے سے احمد نگر کی نظام شاہی میں ایک بہت اہم نام خواجہ محمد دہدار فانی کا ملتا ہے۔جن کے یہاں بھی غزل اور دکن کی زبان کا عمدہ نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

جے مست ہے درس کے انکوں شراب کیا ہے
جس کا گزک جگر ہے تسکوں کباب کیا ہے
از غمزہائے خوبی خوں کرد جان من را
مجھ سے اتیت اوپر اتنا عتاب کیا ہے

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا قیام 1512 میں عمل میں آیا۔اس کا قائم کرنے والا سلطان قلی قطب شاہ تھا۔جو خود بھی اردو زبان و ادب کا شیدائی تھا۔قطب شاہی کا پانچواں فرماں رواں محمد قلی قطب شاہ اردو کا بلند پایہ اور بے مثال شاعر تھا۔اسے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس کی کلیات میں تقریباً تمام شعری اصناف پر طباع آزمائی ملتی ہے۔قطب شاہی عہد ہی میں ہمیں ملا وجہی جیسا شاعر و نثر نگار ملتا ہے۔جس کی نثری تصنیف ''سب رس'' اردو کے کلاسیکی ادب کا سرمایہ ہے۔اسی عہد میں ہمیں ابن نشاطی، غواصی جیسے باکمال شاعر بھی ملتے ہیں۔ملا وجہی اپنے وطن کی تعریف میں کہتا ہے کہ

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

7.7 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے سیکھا کہ

- دکن کسے کہتے ہیں
- علاقہ دکن کی خصوصیات کیا ہیں
- دکن میں اردو کا آغاز و ارتقا کس طرح ہوا
- دکن میں اردو کے آغاز میں صوفیاء کرام کی خدمات کیا ہیں
- دکن میں اردو زبان و ادب کے اولین نقوش کیا ہیں
- دکن میں اردو کے فروغ میں فاتحین نے کیا کردار ادا کیا

7.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ بھارت کے کس علاقہ کو دکن کہا جاتا ہے؟

2۔ دکن میں کن کن راجاؤں نے حکومت کی؟

3۔ دکن میں دراوڑ خاندان کی کون سی زبانیں رائج ہیں؟

4۔ دکن میں جدید ہند آریائی زبان کون سی ہے؟

5۔ اردو کے چند ابتدائی نام کیا ہیں؟

6۔ اردو کی پہلی نثری کتاب کا نام بتایئے؟

7۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟

7.9 سوالات کے جوابات

1۔ بھارت کا وہ جنوبی علاقہ جو کوہ وندھیاچل اور ست پُڑا کی پہاڑیوں کے جنوب میں واقع ہے دکن کہلاتا ہے۔

2۔ دکن میں سات واہن، چالوکیہ، راشٹر کوٹ اور یادو حکمرانوں نے حکمرانی کی۔

3۔ دکن میں کنڑ، تمل اور ملیالم دراوڑ خاندان کی اہم زبانیں ہیں۔

4۔ مراٹھی دکن کی واحد جدید ہند آریائی زبان ہے۔

5۔ اردو کو ہندی، ہندوی، ہندوستانی، گجری، دکھنی، مسلمانی، اردوئے معلیٰ، اردوئے شاہی، محاورہ شاہجہاں آباد اور ریختہ بھی کہا گیا۔

6۔ ایک عرصہ تک خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف تسلیم کیا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق برہان الدین جانم کی ''کلمۃ الحقائق'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔

7۔ قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

7.10 فرہنگ

لفظ	معنی
ارتقاء	ترقی کرنا۔
گھٹ	دنیا

لفظ	معنی
دھولا	دھول، غبار
تے	سے
صوفی	بزرگ۔ پارسا۔ تصوف پر عمل کرنے والا
تذکرہ	ذکر
امتزاج	مل کر ایک ہو جانا۔ دو یا دو چیزوں کی آمیزش
فراخ	لمبا چوڑا۔ عریض و طویل۔
جلتیاں	جلنے والے
سُور	سورج
اتیت	اوجھل۔ غائب۔ سنیاسی
ٹھار	مقام
پنج	پیدا ہونا۔ پیدائش
فاتح	فتح کرنے والا۔ جیتنے والا
لحظہ	لمحہ ۔ پل
گویم	کہنا
حکایت	قصہ ۔ کہانی
ہجر	جدائی
مُجھ	مجھے

7.11 کتب برائے مطالعہ

نصیرالدین ہاشمی	دکن میں اردو	ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1985
ڈاکٹر قیوم صادق	دکنی ادب	کرناٹک ادبی سرکل، گلبرگہ 1988
مولوی عبدالحق	اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا حصہ	انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، دہلی، 1988
عبدالقادر سروری	اردو کی ادبی تاریخ	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، 1958
پروفیسر مسعود حسین خان	مقدمہ شعر و زباں	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، 1966

ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو جلد اول ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
ہارون خان شیروانی سلاطین دکن ترقی اردو بیورو نئی دہلی
ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ عاکف بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی، 2003
ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اردو کی لسانی تشکیل ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ 2000

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 8 شمالی ہند میں اردو نثر اور شاعری کا ارتقا

ساخت :

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 شعر ونثر کے امتیازات

8.4 شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا وارتقا

8.5 شمالی ہند میں نثر کا آغاز وارتقا

8.6 آپ نے کیا سیکھا

8.7 اپنا امتحان خود لیجیے

8.8 سوالات کے جوابات

8.9 فرہنگ

8.10 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

- اس اکائی میں آپ کو یہ بتایا جائے گا کہ شاعری اور نثر کسے کہتے ہیں
- یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ دونوں کی اپنی اپنی شناخت کیا ہے
- دونوں کے کیا کیا امتیازات ہیں اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی
- شمالی ہند میں شاعری کی ابتدا اور ارتقا پر اختصار سے روشنی ڈالی جائے گی
- شمالی ہند میں نثر کے آغاز وارتقا کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا

8.2 تمہید

انسان جو مفرد آوازیں اپنے منہ سے نکالتا ہے اسے حرف کہتے ہیں۔ حرف ایک آواز ہے جس کے معنی نہیں ہوتے۔ مفرد آوازوں کی ترکیب وترتیب سے الفاظ بنتے ہیں جن کے کچھ معنی بھی ہوتے ہیں اور وہ چیزوں کے نام کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی مزید ترتیب وترکیب سے جملے بنتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ زبان کی تشکیل ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب مکمل طور پر بولے جانے والے الفاظ وجود میں آ گئے تو یہ انسان کی ایجاد کردہ چیزوں میں سب سے اہم اور قیمتی ثابت ہوئے۔ زبان خیال، جذبات اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ تو ہے ہی مزید یہ کہ زبان کے استعمال سے انسان کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی مفید

اور مہذب صورتیں پیدا ہوئیں اور اسے اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل ہوئے جو روئے زمین پر دوسرے جانداروں کو حاصل نہ تھے۔

بہر حال تحریر کی ایجاد کے بعد زبان دو حصوں میں بٹ گئی، ایک بولی جانے والی زبان، دوسری لکھی جانے والی زبان۔ اسی کے ساتھ سماج بھی دو حصوں میں بٹ گیا، ایک خواندہ طبقہ اور ایک ناخواندہ طبقہ۔ خواندہ طبقے کے ذریعے رفتہ رفتہ ادب وجود میں آیا جس کی واضح طور پر دو صورتیں ہو گئیں یعنی شاعری اور نثر۔ اب آگے کی سطور میں شاعری اور نثر کی تعریف اور اس کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیا جائے گا۔

8.3 شاعری اور نثر کے امتیازات

شاعری اور نثر کے آغاز وارتقا پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شعر کسے کہتے ہیں اور نثر کیا ہے، دونوں میں فرق کس طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک سادہ سی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ''کلام موزوں شعر ہے اور کلام ناموزوں نثر''۔ لیکن آسان نظر آنے والی یہ تفریق اتنی آسان بھی نہیں کیونکہ اکثر نثر میں بھی موزونیت پائی جاتی ہے اور بہت سے اشعار موزوں ہونے کے باوجود شعر نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود شعر کے ساتھ موزوں ہونے کی شرط سے یکسر انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ شمس الرحمان فاروقی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں وزن کو ہر قسم کی شاعری کے لئے ضروری سمجھتا ہوں لیکن شاعری کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس میں اجمال ہوتا ہے۔''

شعر، غیر شعر اور نثر، شب خوں، کتاب گھر، الٰہ آباد، 1998، ص:72

لیکن صرف اجمال ہی شعر کو شاعری نہیں بناتا اس میں آہنگ و برجستگی ہو اور غیر ضروری الفاظ سے اجتناب بھی برتا جائے۔ چنانچہ شمس الرحمان فاروقی آگے لکھتے ہیں:

''جس تحریر میں موزونیت اور اجمال کے ساتھ ساتھ جدلیاتی لفظ (یعنی تشبیہ، استعارہ یا ایہام) ہوگا وہی شاعری ہوگی۔''

شعر، غیر شعر اور نثر، ص 90

قدیم مشرقی تنقید میں شعر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''موزوں ہو، بامعنی ہو اور بالارادہ کہا گیا ہو۔''

موزونیت اور معنویت سے تو اتفاق کیا جاتا ہے مگر بالارادہ سے بہت سے ناقدین اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سے اشعار بے ارادہ کہے گئے ہیں جو موزوں بھی ہیں اور بامعنی بھی یعنی ان میں شاعری کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ کسی شعر کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا

کہ یہ بالارادہ کہا گیا ہے یا بلا ارادہ۔

موضوعات کے لحاظ سے بھی شاعری کی شناخت کی بات کی جاتی ہے لیکن بہت سے ایسے موضوعات ہیں جو شعر اور نثر دونوں میں مشترک ہیں، لہٰذا شعر کی شناخت اس سے بھی ممکن نہیں۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شعر میں آہنگ ہوتا ہے اور نثر میں نہیں ہوتا ہے۔ آہنگ شعر اور نثر دونوں میں قدر مشترک ہے۔

چنانچہ شاعری کی شناخت کسی حد تک ایجاز، موزونیت، معنویت، آہنگ، جذبہ اور بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب سے ممکن ہے۔

لغوی اعتبار سے نثر سے مراد وہ زبان ہے جو سادہ ہو اور نظم سے مختلف ہو۔ انسان کی عام گفتگو نثر کہلاتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی بات فطری انداز میں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ فطری اور براہ راست گفتگو سے مراد یہ ہے کہ وہ شاعری کی طرح بحر، وزن اور ردیف و قافیے کی پابندی نہیں کرتی۔

نثر انسان کا فطری ذریعۂ ترسیل ہے۔ نثر میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن سے واقعات کی براہ راست ترسیل ہو سکے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نثر میں ایجاز و اختصار نہیں ہوتا۔ کہاوتوں، محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعے نثر میں بھی اختصار و ایجاز برتا جا سکتا ہے اور اس میں معنوی تہہ داری یا معنوی گہرائی ہو سکتی ہے۔

شاعری اور نظم کی ایک وجہ امتیاز یہ بھی ہے کہ شاعری میں قواعد کی پابندی ضروری نہیں۔ شاعری میں یہ ضروری نہیں کہ فعل، فاعل، مفعول اور متعلقات فعل اپنی مقررہ جگہوں پر ہی آئیں۔ ضرورت شعری کے تحت شعر میں ''جانا ہے'' کی جگہ ''ہے جانا'' بھی لکھا جا سکتا ہے لیکن نثر میں اس طرح لکھا جانا غلطی پر محمول کیا جائے گا۔

8.4 شمالی ہند میں شاعری کا آغاز و ارتقا

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی شاعری کی ابتدا پہلے ہوئی چنانچہ پہلے شاعری کو موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے۔

اس بات پر تمام ناقدین متفق ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا دلی اور نواحِ دلی میں ہوئی۔ مگر مختلف سیاسی اور سماجی اسباب کے تحت اس کے ادب کا آغاز و ارتقا پہلے دکن میں ہوا۔ مثال کے طور پر پہلی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' جنوبی ہند میں لکھی گئی، پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق بھی دکن سے ہی ہے۔ اردو کی پہلی تمثیلی داستان ''سب رس'' دکن میں ہی تخلیق ہوئی۔ مثنوی اور غزل کا ارتقا بھی پہلے پہل دکن میں ہی ہوا۔ شمالی ہند میں اردو بول چال کی زبان کی حیثیت سے ترقی کر رہی تھی اور ہلکی پھلکی شعری تخلیقات بھی وجود میں آ رہی تھیں مگر فارسی کا گھنا سایہ اسے پنپنے نہیں دے رہا

تھا، پھر بھی اعلیٰ طبقہ میں نہ سہی یہ عوام میں آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا کے متعلق بات کی جائے تو پہلا نام مسعود سعد سلمان کا ملتا ہے یہ غزنوی دور کا شاعر ہے اس کا زمانۂ حیات 1121-1048ء ہے لیکن مسعود سعد سلمان اور اس کے دیوان کا صرف تذکرہ ہوا ہے، دیوان آج تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

دوسرا نام بابا فرید گنج شکر کا ہے (تاریخ پیدائش 1188ء ہے)۔ آپ کا کلام صوفیانہ پند و نصائح پر مشتمل ہے لیکن کلام میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ یہ بھی شبہہ کیا جاتا ہے کہ یہ کلام بابا فرید گنج شکر کا ہے یا فرید ثانی کا۔

اس سلسلے کا تیسرا اہم نام امیر خسرو کا ہے۔ خسرو آگرہ کے ایک چھوٹے سے قصبے پٹیالی میں 1253ء میں پیدا ہوئے۔ امیر خسرو نے فارسی میں کافی سرمایہ چھوڑا ہے مگر اردو ادب میں ان کی اہمیت ان کے ''ہندوی کلام'' کی وجہ سے ہے۔

امیر خسرو کا شمار شمالی ہند کے اولین شعرا میں ہوتا ہے۔ ''خالق باری'' ایک لمبے عرصے تک امیر خسرو کی تخلیق تسلیم کی جاتی رہی لیکن 1944ء میں محمود شیرانی نے کچھ داخلی اور خارجی شواہد کی بنا پر اسے امیر خسرو کی تخلیق ماننے سے انکار کر دیا۔ گیان چند جین کا کہنا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تخلیق تو ہے مگر اس میں کافی الحاق، ترمیم و تحریف ہو گئی ہے۔ جمیل جالبی اور گوپی چند نارنگ کی رائے ہے کہ یہ امیر خسرو کی ہی تصنیف ہے یہ بحث ہنوز جاری ہے۔

امیر خسرو کے ہندوی کلام کا زیادہ حصہ پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انمل، ڈھکوسلوں اور دوسخنوں پر مشتمل ہے لیکن ان کو بھی مکمل طور پر امیر خسرو کی تخلیق سمجھنے میں دشواریاں ہیں۔ محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان میں سے کچھ چیزیں امیر خسرو کی تخلیق ہیں باقی الحاقی ہیں۔

شمالی ہند کا پہلا دستیاب شعری نمونہ افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہے۔ افضل کے مقام پیدائش اور سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ افضل کے وطن کے سلسلے میں مختلف تذکروں میں چار مقامات کا ذکر آیا ہے: نارنول، پانی پت، جھنجھانہ اور تھانیسر۔ افضل کی تاریخ وفات 1625 بتائی جاتی ہے مگر تمام محققین اس پر متفق نہیں ہیں۔

افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہندوستان کی قدیم صنف سخن بارہ ماسہ میں لکھی گئی ہے۔ ''بارہ ماسہ'' وہ صنف سخن ہے جس میں فراق زدہ عورت جس کا پیا بدیس چلا گیا ہے اپنے ہجر کی کلفتوں کا ذکر دردناک انداز میں کرتی ہے۔ سال کا ہر مہینہ اس کے لئے نیا غم لے کر آتا ہے۔ ''بکٹ کہانی'' بھی ہجر اور انتظار مسلسل کے دکھ کی ایک طویل نظم ہے۔ یہ شمالی ہند کی زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

امیر خسرو اور افضل کے بعد شمالی ہند میں کافی عرصے تک سناٹا ہی رہا۔ شمالی ہند میں ولی کی آمد 1721 سے قبل کے دور کو ریختہ گوئی کا دور کہا جاتا ہے۔ اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے اردو ادب کے اس پہلے دور کو مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہدِ حکومت سے شروع کیا ہے جو 1719 میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس سے پہلے کچھ ایسے شاعر گزرے ہیں جو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ایک آدھ شعر ریختہ میں بھی کہہ لیتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو ایک مصرعہ فارسی میں کہتے اور ایک ریختہ میں۔ ایسے شعرا میں فطرت، امید، بیدل، ندیم اور خان آرزو اہم ہیں۔ ان میں خان آرزو سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سرپرستی میں کئی شعرا ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے اور اس کی بنیاد استوار ہوئی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارھویں صدی کی ابتدا سے ہی ہمیں اردو شاعری کے صاف ستھرے نمونے ملنے لگتے ہیں اور یہیں سے شمالی ہند میں اردو شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے۔ اس پہلے دور میں فائز، آبرو، ناجی، حاتم، یک رنگ، مظہر جان جاناں، مضمون، فغاں، تاباں اور دوسرے بہت سے شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔

شمالی ہند میں باقاعدہ اردو شاعری کا فروغ ہونے میں دیوان ولی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ 1721 میں جب ولی کا دیوان دہلی آیا تو یہاں کے شعرا نے محسوس کیا کہ اس گری پڑی زبان ریختہ میں بھی معیاری شاعری کی جا سکتی ہے اور پھر انھوں نے اپنی پوری تخلیقی قوت اس میں صرف کر دی۔ شمالی ہند کی اردو شاعری میں مذکورہ بالا شعرا کو اس لئے بھی امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے معیاری شاعری کی اور اسے عوام تک پہنچایا۔ فارسی سے مرعوب ہونے کے باوجود ان کی شاعری میں کافی ہندوستانی عناصر پائے جاتے ہیں۔

مذکورہ شعرا میں شیخ ظہور الدین حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بہت نمایاں شخصیت کے حامل ہیں۔ حاتم نے اپنا پہلا دیوان تیار کر لیا تھا جس میں پرانے طرز شاعری کی سبھی خصوصیات ہیں۔ مگر جب شاعری کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی آنے لگی تو انھوں نے اپنا طرز شاعری بھی بدلا۔ پھر کچھ پرانے دیوان سے انتخاب کر کے اور کچھ نئی تخلیقات شامل کر کے ایک دوسرا مجموعہ تیار کیا جس کا نام ''دیوان زادہ'' رکھا۔ ''دیوان زادہ'' کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس کا حاتم نے جو دیباچہ لکھا اس سے وقت کے بدلتے طرز و انداز اور لسانی ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں ایک بڑے صوفی اور فارسی کے بڑے شاعر اور عالم تھے۔ اردو میں ان کا کلام بہت مختصر ہے، پھر بھی اردو ادب کا کوئی تاریخ نگار ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے زبان کو درست کرنے اور ایہام کے ذریعے شاعری کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنانے کے خلاف تحریک شروع کی۔

اس عہد کی شاعری میں فائز کا نام اس لئے بھی بار بار آتا ہے کہ بہت دنوں تک انھیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا رہا۔ مزید یہ کہ ان کے یہاں مقامی رنگ گہرا ہے اور ہندو مذہب کے تیوہاروں اور بزرگوں کا ذکر خاصے دلکش انداز میں ہوا ہے۔

اب دلی اردو شاعری کا مرکز بنتی جارہی تھی اور دکنی اثرات رفتہ رفتہ کم ہورہے تھے۔ اس وقت تک نثر کی طرف بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ شاعری میں مثنوی، مرثیہ اور دوسری اصناف میں بھی کچھ تصانیف ہورہی تھیں مگر اس عہد میں سب سے زیادہ عروج غزل کو حاصل ہوا۔

شمالی ہند میں اب جو دور آتا ہے اسے میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے دور سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اردو شاعری کا سنہرا دور ہے۔ اس دور تک آتے آتے شمالی ہند میں اردو شاعری نصف صدی سے زیادہ کا سفر پوا کر چکی تھی (یعنی اٹھارھویں صدی کا نصف سے زیادہ)۔ اس دور میں اردو شاعری کی تمام اصناف کو عروج حاصل ہوا۔

میرؔ، دردؔ اور سوداؔ ہم عصر ہیں اور ایک ہی تہذیبی دور کے شاعر ہیں مگر تینوں اپنی اپنی جداگانہ ادبی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی بدولت اردو میں موضوعات اور خیالات کی رنگارنگی اور تجربات کی کثرت نظر آتی ہے۔

سوداؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا 38-1728 کے درمیان کی اور حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ ہر طرف فارسی کا دور دورہ تھا۔ سوداؔ بھی فارسی کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن پھر آرزو کی تحریک سے متاثر ہوکر انھوں نے اردو میں اپنی ساری تخلیقی قوت صرف کردی۔ سودا نے ابتدا میں سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا پھر مزاج کی عدم مطابقت کے تحت اسے ترک کرکے کل وقتی شاعر بن گئے۔

سماجی اور معاشی وجوہات کے تحت انھوں نے دلی سے ہجرت کی اور مختلف مقامات پر قیام کیا اور بالآخر 1774 میں لکھنؤ پہنچے۔ یہ آصف الدولہ کا دور تھا، وہیں 1781 میں ان کا انتقال ہوا۔ سودا کا ذہن ایک ہمہ جہت تخلیقی ذہن تھا انھوں نے قصیدہ، غزل، ہجو، شہر آشوب، قطعات اور مراثی میں اپنی تخلیقی قوت کا کامیاب مظاہرہ کیا۔ اتنی بہت ساری اصناف میں کمال حاصل کرنے والا شخص پہلی بار شمالی ہند کے ادبی منظرنامے پر رونق افروز ہوا اور اس کی آمد سے اردو شاعری کے بازار میں رونق ہی رونق پھیل گئی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی فارسی کا نشہ اترا نہیں تھا۔ خواجہ میر درد (سنہ ولادت 1720) نے پندرہ سال کی عمر میں فارسی میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ اپنی پہلی تصنیف ''اسرار الصلوۃ'' فارسی زبان میں لکھی۔ خواجہ میر درد کی بارہ تصنیفات ہیں۔ دیوان اردو کے علاوہ ان کی تمام تصانیف فارسی میں ہیں جس میں فارسی دیوان بھی شامل ہے۔

میر درد نوجوانی میں سپاہی پیشہ تھے مگر کچھ عرصہ بعد والد کی ایما سے 29 سال کی عمر میں اس سے دست

بردار ہو کر لباس درویشانہ پہن لیا۔ موسیقی میں اچھی دسترس حاصل تھی ان کی زندگی ایک درویش کی زندگی تھی مزاج میں ایسا استقلال تھا کہ جب دلی اجڑ رہی تھی اور اہل کمال دلی چھوڑ کر جا رہے تھے میر درد نے تمام کلفتیں برداشت کیں مگر دلی نہ چھوڑی۔

درد کی شاعری میں صوفیانہ تصورات کا اظہار بڑے پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ عملی زندگی میں بھی تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ درد کا زیادہ تر کلام غزل کی صنف میں ملتا ہے اور بقول محمد حسین آزاد وہ تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے ہیں۔ وہ رباعی کے بھی بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

میر درد کے چھوٹے بھائی میر محمد اثر بھی اردو کے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کا انداز شاعری بھی میر درد سے مشابہ ہے۔ ان کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے۔ میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' بہت مقبول و مشہور ہے۔

اس دور کے شعرا میں میر تقی میر کو سب پر فضیلت حاصل ہے۔ ان کے حالات زندگی سے واقفیت کا ذریعہ ان کی فارسی میں لکھی آپ بیتی ''ذکر میر'' ہے وہ آگرہ میں 1722ء میں پیدا ہوئے۔ میر کے والد ایک صوفی منش انسان تھے، میر ابھی دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا جو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اکبر آباد میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میر بے سہارا ہو کر تلاش معاش میں سرگرداں ہوئے مگر آگرہ میں روزگار کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو دہلی آ گئے لیکن یہاں بھی ان کی پریشان حالی کم نہ ہوئی۔ دہلی میں وہ اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے مگر کچھ دنوں بعد کسی بات پر ان سے تعلقات خراب ہو گئے۔ میر نے دہلی پہنچ کر بہت سے امیروں کے یہاں ملازمتیں کیں مگر معاش کی کوئی بہتر صورت پیدا نہ ہوئی۔ دلی کی بگڑتی ہوئی حالت اور بڑھتی ہوئی پریشانیوں کی وجہ سے انھوں نے لکھنؤ کی راہ لی۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ لکھنؤ میں ہی 1810 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میر کے چھ اردو دیوانوں کے علاوہ ان کی کئی کتابیں فارسی میں ہیں۔ جیسے ذکر میر، نکات الشعرا، فیض میر اور ایک فارسی دیوان۔ میر کے یہاں کچھ مثنویاں اور مرثیے بھی پائے جاتے ہیں لیکن وہ بادشاہ غزل کے ہی ہیں۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''میر آج تک غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے شعر تیر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔ سیدھی سادھی بول چال کی زبان میں اتنا مزہ اور اتنی مٹھاس، اتنا زہر اور اتنی تلخی، دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری اور جذبات کا اتنا طوفانی جوش تخلیق شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

''احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ص، 70

مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد حکومت (محمد شاہ 1719 میں تخت نشین ہوئے تھے) میں نادر شاہ درانی اور پھر 1757 کے قریب احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد دلی میں جو تباہی و بربادی ہوئی اور جو معاشی انحطاط پیدا ہوا اس سے پریشان ہو کر جب شاعروں وفن کاروں نے یہ دیکھا کہ اب دہلی میں خوردو نوش بھی دشوار ہے تو انھوں نے مختلف ریاستوں اور درباروں کا رخ کیا۔ جس میں دربارِ اودھ سب سے اہم تھا جس کا مرکز لکھنؤ تھا۔ ہجرت کرنے والے شعرا میں فغاں، تاباں، رنگین، سوز، ضاحک، میر حسن، جرأت، انشاء، مصحفی، سودا اور میر تقی میر اہم ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشاء کا شمار اس دور کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں، قصیدے، قطعات اور منظومات شامل ہیں۔ فارسی دیوان کے علاوہ فارسی نثر میں دریائے لطافت اور لطائف السعادت، اردو نثر میں رانی کیتکی کی کہانی اور سلک گہر موجود ہیں۔ انشاء اردو و فارسی کے علاوہ ترکی، پشتو، پنجابی، کشمیری اور مارواڑی بھی جانتے تھے۔

انشا کے دوست سعادت یار خاں رنگین اردو دنیا میں اس لیے مشہور ہیں کہ انھوں نے عورتوں کی بول چال میں ان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل اور صورت حال پر ان کی زبان میں نظمیں لکھیں جسے ریختی کا نام دیا گیا۔ رنگین اپنے کو اس صنف کا موجد لکھتے ہیں۔ انشا نے بھی ایسی ہی نظمیں لکھی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دکن کے شاعر ہاشمی بیجاپوری نے پہلے پہل ریختی لکھی تھی۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ریختی کا موجد کون ہے۔

مصحفی بھی اردو کے بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انشا اور مصحفی کی شاعرانہ چشمک اور رقابت جو کبھی کبھی غیر مہذب شکل اختیار کر لیتی تھی کافی مشہور ہے۔ مصحفی بہت پر گو شاعر تھے اور افلاس کی وجہ سے معاوضہ لے کر اپنی غزلیں دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے آٹھ دیوان دستیاب ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں لیکن قیصدے، مثنوی وغیرہ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان کے تصنیف کیے گئے تین تذکرے عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

یہاں تک لکھنؤ سے متعلق جن شعرا کا ذکر ہوا ان کی زندگی کا زیادہ حصہ دلی یا دوسرے مقامات پر گزرا لیکن زندگی کا آخری حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ اس لئے ادبی مؤرخین انھیں دلی اور لکھنؤ دونوں میں شمار کرتے ہیں۔

دبستان لکھنؤ کے خالص لکھنوی شعرا میں ناسخ اور آتش کی حیثیت مسلم ہے۔ لکھنؤ اسکول کو جو اہمیت و انفرادیت حاصل ہوئی وہ انھیں دونوں کی مرہون منت ہے خصوصاً ناسخ کی۔ امام بخش ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے، انھیں ورزش کا بہت شوق تھا اور وہ بہت خوش خوراک بھی تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دینا چاہا مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ نظام حیدر آباد نے بلایا مگر وہاں بھی نہ گئے لکھنؤ میں ہی وہ 1830ء میں پیوند زمین ہوئے۔ اصلاح زبان کے لیے وہ ہمیشہ

یاد کیے جاتے رہیں گے اس سے کچھ نقصان بھی ہوا یعنی زبان کی ترقی کے رخ محدود ہو گئے اور خیال کے بدلے الفاظ اور صنائع بدائع پر زور دیا جانے لگا، فائدہ یہ ہوا کہ زبان کے استعمال کا ایک معیار بن گیا جس سے فن شاعری کے اصول مرتب ہوئے۔

خواجہ حیدر علی آتش کی ولادت بھی فیض آباد میں ہوئی۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا جس کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ صوفی خانوادے سے تعلق رکھنے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے اندر قناعت، خودداری اور ایک طرح کا بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔

آتش جب لکھنؤ آئے اس وقت انشا اور مصحفی کا بول بالا تھا۔ یہ بھی مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد یہ رشتہ منقطع کر لیا۔ لکھنؤ آنے کے بعد جلد ہی ان کا شمار بڑے شعرا میں ہونے لگا۔ آتش کے دو دیوان شائع ہوئے ہیں جن میں غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہے وہ غزلوں میں تصوف کے نازک اور عمیق خیالات کو ظاہر کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، گویا، بحر، منیر اور مہر اور آتش کے شاگردوں میں رند، صبا، نسیم، خلیل اور شوق اہم ہیں۔ پھر ان شاگردوں کے شاگرد ہوئے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔

آتش کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے ان کی مثنوی گلزار نسیم نے انھیں زندگیٔ جاوید عطا کر دی۔

دوسری کئی شعری اصناف کی طرح مرثیے کو بھی لکھنؤ میں ہی عروج حاصل ہوا گو کہ اس کی ابتدا دکن سے ہو گئی تھی دہلوی شعرا نے بھی اسے تھوڑا بہت برتا۔ سودا نے کافی مرثیے لکھے اور مرثیے کے ادبی حسن پر بھی زور دیا لیکن اسے حقیقی عروج لکھنؤ میں ہی حاصل ہوا۔ لکھنوی شعرا میں دلگیر، فصیح، خلیق اور ضمیر نے اس صنف کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کے بعد میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر نے مرثیے کو اس بلندی تک پہنچا دیا کہ اس میں پھر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔

مجموعی طور پر لکھنؤ اسکول کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہاں کی شاعری میں بہت سی کمیاں تھیں لیکن اس اسکول کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں بہت سی نئی اصناف کا آغاز و ارتقا ہوا جیسے ریختی، واسوخت اور منظوم ڈراما۔

اس دور میں ایک ایسا شاعر پیدا ہوا جو نہ دلی کا تھا نہ لکھنؤ کا بس وہ اپنی مثال آپ تھا اس کا نام نظیر اکبر آبادی ہے۔ یہ 1740 کے قریب دہلی میں پیدا ہوا مگر ساری زندگی آگرہ میں گزاری۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئے معاشی حالات کے تحت پورے ہندوستان میں غربت و افلاس پھیلا ہوا تھا ملک کی ساری دولت سمندر پار جا رہی تھی اور دیہی زندگی کا وہ ڈھانچہ منتشر ہو رہا تھا جس پر معاشی زندگی منحصر تھی۔

نظیر کا نام ولی محمد تھا، نظیر تخلص تھا گو کہ وہ پیدا دلی میں ہوئے تھے مگر زندگی کا بڑا حصہ اکبر آباد (آگرہ) میں گزارنے کی وجہ سے تخلص کے ساتھ اکبر آبادی لگا لیا۔ انھوں نے مروجہ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ مدرسی میں گزرا۔

نظیر نے اپنے عہد کی مروجہ روایتی شاعری سے انحراف کیا۔ انھوں نے ان موضوعات اور صورت حال کو پیش کیا جو معاشرے میں اقتصادی تباہ حالی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ نظیر ایک درویش صفت اور قلندرانہ مزاج رکھنے والے انسان تھے اور تصوفانہ اثرات کے تحت ہر مذہب وملت کے انسان سے محبت کرنا ان کا شیوہ تھا، ان کے یہاں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔

نظیر کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ایک میں صرف نظمیں ہیں جو کلیات نظیر کے نام سے موسوم ہے دوسرے میں صرف غزلیں ہیں۔ ادب میں انھیں جو مقام حاصل ہے وہ ان کی نظموں کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عوامی زبان کا فطری ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ نظیر عوام سے عوام کی سیدھی سادی زبان میں براہ راست خطاب کرتے ہیں۔ ہر بڑے تخلیق کار کی طرح وہ اپنی شاعری کی زبان خود خلق کرتے ہیں۔

نظیر الفاظ کے بادشاہ ہیں الفاظ کا سمندر ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ وہ جس لفظ کو جہاں چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں استعمال کر لیتے ہیں۔ انھوں نے عوامی بولیوں سے سینکڑوں الفاظ لے کر اردو میں اس طرح کھپا دیئے کہ وہ اردو کا حصہ بن گئے۔ وہ عوامی بولیوں کے الفاظ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ سیاق وسباق سے ان کے معنی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا دلی کے بار بار اجڑنے اور برباد ہونے سے لکھنؤ اور دوسرے درباروں کی رونقیں بڑھیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دلی میں شعر وسخن کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ دلی میں کچھ سکون ہوا تو شعر وشاعری کی رفتار تیز ہوئی جو بہت دھیمی ہوگئی تھی۔ اس عہد کے اہم شعرا میں ذوق، غالب، مومن اور بہادر شاہ ظفر اہم ہیں۔

محمد ابراہیم ذوق کی شہرت اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہو گئے تھے۔ وہ 1789 میں دہلی میں پیدا ہوئے کچھ دن شاہ نصیر سے اصلاح لی پھر اپنی محنت وریاضت سے اتنی ترقی کر لی کہ بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے انھیں ملک الشعرا کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔

ذوق کا ایک دیوان دستیاب ہے جس میں زیادہ تر قصیدے اور غزلیں ہیں۔ انھیں سودا کے بعد اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذوق نے اچھی غزلیں بھی کہی ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے۔

مرزا اسد اللہ خان غالب اس عہد کے ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے عظیم شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں وہ آگرہ میں 1797 میں پیدا ہوئے۔ یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کتنی تعلیم حاصل کی مگر ان کی

تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام علوم مروجہ سے بخوبی واقف تھے۔

غالب کو فارسی پر بہت دسترس حاصل تھی۔ وہ جتنے بڑے شاعر اردو کے ہیں اتنے ہی بڑے شاعر فارسی کے بھی ہیں۔ ان کی فارسی دانی کے اہل ایران بھی معترف ہیں۔

1850 کے آس پاس وہ فارسی میں مغل خاندان کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے ''مہر نیم روز'' کے نام سے انھوں نے اس کا ایک حصہ مکمل کیا جو ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہو گئے تھے۔ مگر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ 1857 کی جنگ آزادی نے سب کچھ منتشر کر دیا۔ غالب نے فارسی میں ایک ڈائری ''دستنبو'' کے نام سے لکھی جس سے اس وقت کے بہت سے واقعات کی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔

غالب نے اردو میں چند قصیدے اور زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ غزل میں تو انھوں نے نئی راہ بنائی ہی تھی قصیدے میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی اور سہل ممتنع میں قصیدے کہے۔

مومن خاں مومن 1800 میں دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اچھی تعلیم حاصل کی اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ اچھے شاعر ہونے کے باوجود شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ مہاراجہ پٹیالہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھنے کے علاوہ انھوں نے کسی بادشاہ یا امیر کی مدح نہیں کی۔ البتہ کچھ قصیدے بزرگان دین کی تعریف میں لکھے جو ان کی قادرالکلامی کے گواہ ہیں۔ مومن نے چند عاشقانہ مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں جذباتیت نمایاں ہے۔ فارسی میں ان کا ایک دیوان اور کچھ نثری تخلیقات بھی ہیں اس سب کے باوجود ان کی شناخت غزلوں کی وجہ سے ہے۔ مومن نے غزلوں میں عاشقانہ جذبات کو بہت انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اور تخلص کو بہت ذو معنی انداز میں برتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر اس عہد کے ایک کامیاب شاعر ہیں خصوصاً غزلیہ شاعری میں ان کا مقام کافی بلند ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں انھوں نے اپنا تخت و تاج کھویا۔ انگریزوں نے انھیں قید کر کے رنگون بھیج دیا وہیں 1868 میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ظفر ایک زود گو شاعر تھے تصوفانہ اور اخلاقی مضامین کے علاوہ عشقیہ مضامین بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہادر شاہ کے لیے ذوق شعر کہہ دیا کرتے تھے لیکن یہ بات اس لیے درست نہیں معلوم ہوتی کہ بہادر شاہ کا کلام ان کے اپنے رنج و غم کے جذبات سے مملو ہے۔ کہیں کہیں تو ان کے اشعار ان کی اپنی آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ بہادر شاہ کی شاعری کا بڑا حصہ ان کی زندگی کا عکس ہونے کے سبب حقیقی جذبات سے پر ہے اور یہی ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہے۔

سیاسی انحطاط اور معاشی ابتری کے باوجود اردو شاعری کی روایات کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ چنانچہ دلی میں شیفتہ، مجروح، نسیم، ظہیر، انور، داغ وغیرہ اور لکھنؤ میں اسیر، برق، بحر، منیر، شوق، قلق، امانت اور امیر مینائی وغیرہ اس روایت کو پروان چڑھا رہے تھے۔

نئی تعلیم اور نئے سماجی شعور کے باعث اب لوگ شاعری کے نئے طرز واسلوب کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یہ نئی سوچ نئی فکر مغربی اثرات سے بھی متاثر تھی۔ لہٰذا اس نئی سوچ اور نئی فکر کی بنیاد محمد حسین آزاد نے رکھی، ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا، 8 مئی 1874 کو پہلا یادگار مشاعرہ ہوا جس میں نئے طرز کی نظمیں پڑھی گئیں۔ محمد حسین آزاد نے بے حد معلومات افزا لکچر دیا جس میں حقیقی جذبات کی عکاسی اور مقامی رنگ اور زندگی کی سچی عکاسی کرنے کی سفارش کی۔ گویا یہ جدید اردو شاعری کی ابتدا تھی۔ پھر حالی اور دوسرے لوگ بھی اس تحریک سے جڑ گئے۔ حالی شاعر کے ساتھ ساتھ نقاد اور واعظ و معلم بھی تھے۔ وہ شاعری کے ذریعے بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دور کے دو بڑے نظم گو شبلی نعمانی اور اکبر الٰہ آبادی ہیں۔

سرور جہاں آبادی، جوالا پرشاد برق، مہاراجہ کشن پرشاد شاد اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اس عہد میں سب سے اہم علامہ اقبال اور چکبست ہیں۔ چکبست 1882 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور 1926 میں انتقال ہوا۔ ان کی نظموں میں جذبہ حب الوطنی اور ہندو مسلم اتحاد کا غلبہ ہے۔

علامہ اقبال کا شمار اردو ادب کے عظیم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ 1872 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر لاہور چلے گئے۔ فلسفے میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی پھر جرمنی سے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ 1938 میں وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ علامہ اقبال کے اردو میں چار مجموعے ہیں: بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز۔ فارسی میں بھی ان کی تخلیقات بہ اعتبار مقدار و معیار کافی وقیع ہیں۔ فنی و جمالیاتی نقطۂ نظر سے ان کا معیار کافی بلند ہے۔

دورِ جدید میں مختلف وجوہات کی بنا پر غزل کی مخالفت کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ غزل کے روبہ انحطاط اثر کو زائل کرنے اور اس کو ترقی عطا کرنے میں جن شاعروں نے اہم رول ادا کیا ان میں شاد عظیم آبادی، فانی بدایونی، ریاض خیرآبادی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور یگانہ چنگیزی وغیرہ اہم ہیں۔

آگے چل کر اردو شاعری دو خانوں میں بٹتی نظر آتی ہے جسے ہم ترقی پسندی اور جدیدیت کہہ سکتے ہیں۔ ترقی پسندی کی طرف جن شاعروں کا جھکاؤ تھا ان میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش، فیض احمد فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اہم ہیں۔ یہ فہرست کافی طویل ہے لیکن سبھی کی یہاں گنجائش نہیں۔

جدیدیت کا رجحان رکھنے والے شعرا میں میراجی، ن۔ م۔ راشد، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، عمیق حنفی، شہریار، کمار پاشی، ساقی فاروقی کافی اہم ہیں۔ یہ فہرست بھی کافی طویل ہے یہاں سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

8.5 شمالی ہند میں اردو نثر کا آغاز وارتقا

اردو میں نثری ادب کا ارتقا بمقابلہ شاعری، تاخیر سے ہوا جیسا کہ اکثر زبانوں کے ادب میں ہوتا رہا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں نثر نگاری کے بنیاد گزاروں میں صوفیا کا رول اہم ہے۔ ذکر آ چکا ہے کہ اردو ادب کا ارتقا پہلے دکن میں ہوا چنانچہ شاعری کی طرح نثر کی ابتدا بھی پہلے دکن سے ہی ہوئی۔ لہٰذا وہاں کے صوفیا میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پہلے صوفی ہیں جن کا نام نثر کی تخلیق سے جڑا ہوا ہے۔ معراج العاشقین، شکارنامہ اور تلاوۃ الوجود کو ان سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہی ان کے مصنف ہیں۔ یہ امر مشکوک ہے اور ان کے زمانۂ تصنیف کا تعین بھی نہیں ہو سکا ہے۔ اسی طرح میراں جی شمس العشاق (شرح مرغوب القلوب)، برہان الدین جانم (کلمۃ الحقائق)، امین الدین اعلیٰ (گنج مخفی) بھی اہم ہیں کہ انھوں نے نہ صرف نثر کی بنیاد ڈالی بلکہ اسے عوام میں فروغ دیا۔

اردو کی پہلی ادبی تخلیق ملا وجہی کی ''سب رس'' (1635) بھی دکن میں ہی لکھی گئی۔ شمالی ہند کی بات کریں تو یہاں اردو نثر کی ابتدا عہد محمد شاہی (1719 تا 1748) میں ہوئی اور شمالی ہند کی سب سے پہلی نثری تصنیف ہونے کا شرف فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' کو حاصل ہوا۔ یہ کتاب 1731ء میں مرتب کی گئی پھر 1748 میں فضلی نے اس میں کچھ ترمیم کی۔ یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ہے۔ اس میں حضرت امام حسین کی شہادت کا بیان تاریخی اور مذہبی اعتبار سے کیا گیا ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا نے اپنے مرثیوں کے مجموعے کا دیباچہ اردو میں لکھا جو نثر کے ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے الگ الگ قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ 1784 اور 1790 میں کیا۔ ان تراجم کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔ اردو میں قرآن شریف کے کچھ اور ترجمے بھی ہوئے جن کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ کچھ مذہبی رسالے بھی لکھے گئے۔ مذہبی تخلیقات کے علاوہ 1775 میں فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' کا ترجمہ میر عطا حسین تحسین نے اردو میں کیا اس کا نام ''نوطرز مرصع'' ہے۔ اس کا اسلوب بہت مشکل اور مقفیٰ و مسجع ہے پھر بھی یہ اردو کے داستانی ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔

ویلور کے محمد باقر آگاہ تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے پندرہ اردو میں ہیں۔ ان میں نظمیں زیادہ ہیں لیکن ان کے دیباچے نثر میں لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک کتاب ''ریاض السیر'' اردو میں ہے۔ ریاض السیر اور دیباچوں کی زبان سادہ اور آسان ہے۔

عیسوی خاں بہادر کی ''قصہ مہر افروز دلبر'' 1752 کے لگ بھگ تصنیف ہوئی۔ یہ شمالی ہند کی سب سے قدیم اردو داستان ہے جو سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں تخلیق کی گئی ہے۔ یہی حال

''عجائب القصص'' کا ہے، یہ بھی نہایت آسان اور شستہ زبان کی تخلیق ہے۔اس کے مصنف شاہ عالم ثانی ہیں اور یہ 91-1790 میں لکھی گئی۔مہر چند کھتری لاہوری کی ''نوآئین ہندی یا قصہ یوسف ملک وگیتی افروز'' 95-1794 میں تصنیف ہو چکی تھی۔ان کتابوں کا صاف اور سلیس اسلوب اس بات کا گواہ ہے کہ صاف شستہ اور سلیس نثر کو فروغ دینے کا سہرا صرف فورٹ ولیم کالج کے سر نہیں ہے۔بلکہ اس سے الگ بھی عام فہم نثر اپنی ایک شکل بنا چکی تھی۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کے ارتقا میں بہت اہم کردار ادا کیا۔اس کے ذریعے اردو نثر کی نہایت اہم کتابیں شائع ہوئیں۔جن سے اردو نثر کو کافی ترقی ملی لیکن فورٹ ولیم کالج کا مقصد نو وارد انگریزوں کو اردو سکھانا تھا۔کیونکہ مقامی رابطے کی زبان اردو تھی یہ زبان سیکھ کر وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے اور اقتدار کو مستحکم بنا سکتے تھے۔

کالج میں گل کرسٹ ہندوستانی شعبے کے نگراں مقرر ہوئے انھوں نے بول چال، لغت اور قواعد وغیرہ پر اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں۔وہ 1783 میں ہندوستان آئے تھے اور 1804 میں وطن واپس چلے گئے۔گل کرسٹ جتنے دنوں ہندوستان میں رہے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے لوگوں کو اکٹھا کرتے رہے جو ان کی ہدایت کے مطابق اردو نثر میں تصنیف کر سکیں۔ان میں میر امن، حیدر بخش حیدری، افسوس، نہال چند لاہوری، مظہر علی ولا، حسینی اور کاظم علی جوان بہت اہم ہیں۔

میر امن دہلوی نے صرف دو کتابیں لکھیں ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' لیکن انھیں دو کتابوں نے انھیں زندگی جاوید عطا کر دی۔میر امن کی باغ و بہار عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع'' کا ترجمہ ہے، مگر اس کا اسلوب اتنا دل نشین ہے کہ یہ میر امن کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ان کی دو کتابیں ''طوطا کہانی'' اور ''آرائش محفل'' بے حد مقبول ہوئیں۔

میر شیر علی افسوس بھی کالج کے اہم مصنفین میں سے ہیں ان کی دو کتابیں بہت اہم تسلیم کی جاتی ہیں، ''آرائش محفل'' اور ''باغ اردو''۔

میر بہادر علی حسینی کا تقرر غالباً کالج میں سب سے پہلے ہوا تھا۔ان کی کتابوں میں دو کتابیں بے حد مقبول ہوئیں، ''نثر بے نظیر'' اور ''اخلاق ہندی''۔

مظہر علی خاں ولا کا شمار بھی کالج کے اہم مصنفین میں ہوتا ہے یہ 1802 میں کالج میں ملازم ہوئے۔ یہ سنسکرت، فارسی اور ہندی کے عالم تھے۔''مادھونل اور کام کنڈلا''، ''بیتال پچیسی'' اور ''تاریخ شیر شاہی'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

کاظم علی جوان نے بھی کئی کتابیں لکھیں اور للولال جی کو سنگھاسن بتیسی لکھنے میں مدد دی۔ نہال چند لاہوری بھی کالج کے ملازم تھے اور 1803 میں گل کرسٹ کے کہنے پر ''گل بکاؤلی'' کی مشہور کہانی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ وہی مشہور کہانی ہے جس کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے 1838 میں مثنوی گلزار نسیم کی شکل میں پیش کیا۔

بینی نرائن جہاں کالج میں اس وقت ملازم ہوئے جب گل کرسٹ جا چکے تھے۔ انھوں نے دو کتابیں تصنیف کیں ایک کا نام ''چہار گلشن'' اور دوسری ''دیوان جہاں'' ہے۔ یہ 125 شاعروں کا تذکرہ ہے اس میں مصنف نے اپنے کلام کا بڑا حصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مصنفین تھے جنھوں نے اردو نثر کے سرمایے میں اضافہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج میں مذکورہ تمام کتابوں کو تیار کرنے کا مقصد انگریزوں کے لئے ایسا مواد تیار کروانا تھا جس سے انھیں اردو سیکھنے میں مدد ملے۔ یہ زیادہ تر قصے کہانیوں تک محدود ہے اس میں کسی سنجیدہ موضوع کی تلاش بے کار ہے۔ بہت دنوں تک کالج کے باہر لوگ ان سے ناواقف رہے اور کالج کے باہر اپنے طور پر بھی اردو نثر کا ارتقا ہوتا رہا۔ جن میں سے کچھ کا تذکرہ آ چکا ہے۔ باقی پر یہاں اختصار سے روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں ہی لکھنؤ باقاعدہ ادبی مرکز بن چکا تھا اور کافی تعداد میں وہاں اہل قلم جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کا بھی ارتقا ہو رہا تھا۔

شاعری کے سلسلے میں انشاء اللہ خاں انشا کا ذکر ہوا لیکن وہ صرف شاعری کے ہی مردِ میداں نہیں تھے بلکہ انھوں نے نثر کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ''رانی کیتکی کی کہانی'' اردو اور ہندی میں یکساں مقبول ہے۔ اس میں انھوں نے شعوری طور پر ایسی زبان کا استعمال کیا ہے جس میں عربی، فارسی اور بھاکا کے الفاظ نہ آئیں۔ زبان کے لحاظ سے اس کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی نثر صاف ستھری اور رواں ہے۔ انشاء کی دوسری اہم کتاب دریائے لطافت ہے یہ کتاب فارسی میں ہے مگر اس میں اردو زبان کے دلچسپ نمونے دیے گئے ہیں۔ یہ کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی پہلی اردو قواعد ہے۔ انشاء کی تیسری کتاب ''سلک گہر'' ہے۔ اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نقطے والا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

لکھنؤ کے سب سے اہم نثر نگار رجب علی بیگ سرور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گو کہ انھوں نے شاعری بھی کی اور شہسواری بھی، خطاطی اور تیراندازی میں بھی کمال حاصل کیا۔ مگر انھیں شہرت دوام ان کی تخلیق ''فسانۂ عجائب'' کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس داستان کو انھوں نے 1824 میں لکھا۔ اس کا اسلوب رنگین اور پیچیدہ ہے، عبارت صنائع سے پُر اور مقفیٰ ہے۔ سرور نے ہر موقع کے مطابق الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس تصنیف سے لکھنوی تہذیب کی بڑی واضح عکاسی ہوتی ہے۔ رجب علی بیگ سرور 1787 میں پیدا ہوئے اور 1867 میں ان کا انتقال ہوا۔

یہاں دلی کالج اور اس سے متعلق ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے داستانی ادب، تاریخ اور مذہبی کتابوں کے ترجمے کرائے تو اس سوسائٹی نے سائنس، نجوم، ریاضی، منطق اور فلسفے کو اپنے دائرہ کار میں شامل کیا۔ اس سوسائٹی نے سوا سو سے زیادہ کتابیں تیار کرائیں۔

دلی کالج کے ایک اہم استاد اور مترجم ماسٹر رام چندر تھے۔ انھیں ریاضی سے خاص لگاؤ تھا۔ ریاضی کی کئی کتابیں ترجمہ کیں، کئی علمی کتابیں بھی لکھیں۔ انھوں نے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبّ ہند'' کے نام سے دو رسالے شائع کئے اور ان کے ذریعے سائنسی خیالات کو پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔ شاعری کے سلسلے میں غالب کا ذکر ہوا مگر نثر کے ارتقا میں بھی غالب کا بہت اہم رول ہے۔ غالب نے اپنے اردو خطوط کے ذریعے خطوط نگاری کے طرز، طریقے اور رنگ ڈھنگ کو ہی نہیں بدلا، مراسلے کو مکالمہ ہی نہیں بنایا بلکہ اردو نثر کو ایک رنگین، شستہ اور سلیس اسلوب بھی عطا کیا۔ احتشام حسین نے غالب کے ان خطوط کو اردو ادب کا انمول رتن کہا ہے تو صحیح کہا ہے۔ تاریخ نویسوں کے مطابق 1846 سے غالب نے اردو میں خطوط لکھنے شروع کئے۔ پھر اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اردو میں ہی لکھتے رہے۔ 1846 سے پہلے تک وہ فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ ان کے خطوط کے اب تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے ''عود ہندی''، ''اردوئے معلیٰ'' (دو حصے)، ''مکاتیب غالب''، ''خطوط غالب''، ''نادر خطوط غالب''۔

اس عہد کے ایک اچھے نثر نگار خواجہ امان نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے دس حصوں پر مشتمل فارسی داستان ''بوستان خیال'' کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن اس کے صرف پانچ حصے ہی ترجمہ کر سکے اور راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ ان کی زبان نہایت شیریں، سہل اور بامحاورہ ہے۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو نثر نگاری بلکہ اردو ادب اور زندگی میں نیا تعلق پیدا ہوا۔ زبان و بیان، اسالیب اور موضوعات میں بہت وسعت پیدا ہوئی۔ اس کا سہرا علی گڑھ تحریک کے سر جاتا ہے جس کے بانی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا تھے۔

سرسید احمد خاں اردو کے بڑے ادیب ہی نہیں بلکہ مصلح قوم، دانشور، صحافی اور رہبر قوم بھی تھے۔ وہ 1817 میں دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم حاصل کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ بہت جلد منصف ہو گئے۔ ان کا تبادلہ غازی پور ہوا تو وہاں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ 1866 میں وہ علی گڑھ آئے تو سوسائٹی کا دفتر بھی وہیں آ گیا۔ جس کا مقصد مختلف علوم کا اردو میں ترجمہ کرنا اور سائنسی خیالات اور سائنسی طرز فکر کو عام کرنا تھا۔ کچھ عرصہ بعد سرسید نے علی گڑھ میں ایک اسکول کھولا جو 1878 میں کالج ہو گیا۔ 1920 میں یہی کالج مسلم یونیورسٹی بنا۔

سرسید یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بغیر کسی عوامی ذریعہ ابلاغ کے وہ اپنی بات عوام تک نہیں پہنچا سکیں گے چنانچہ 1866 میں انھوں نے ایک ہفت روزہ ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' جاری کیا۔

انگریزی میں اس کا نام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے ایک رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' 1879 میں جاری کیا۔اس کے علاوہ ان کی چھوٹی بڑی تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جس میں آثار الصنادید، تاریخ ضلع بجنور، تاریخ سرکشی بجنور، رسالہ اسباب بغاوت ہند، خطبات احمدیہ اور مضامین کا مجموعہ بہت اہم ہیں۔1898 میں علی گڑھ میں ان کی وفات ہوئی۔

اردو نثر کے ارتقا میں محمد حسین آزاد (1910-1833) کا بھی بہت اہم رول ہے۔جدید ادب کو فروغ دینے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا لیکن وہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ان کی مشہور و مقبول کتابوں میں قصص ہند، آب حیات، نیرنگ خیال، دربار اکبری، سخندان فارس وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی (1914-1837) کا شمار سرسید احمد خاں کے اہم رفقا میں ہوتا ہے۔ان کی اہم کتابوں میں مجالس النسا، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب اور حیات جاوید ہیں۔ ان کے مقالات اور خطوط کے مجموعے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید، سوانح نگاری کے ایک نئے طرز و انداز کی غماز ہیں۔مقدمہ شعر و شاعری ویسے تو ان کے مجموعۂ نظم کا مقدمہ ہے لیکن مجموعی طور پر یہ اردو تنقید کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں پہلی بار شاعری کو منظّم اور علمی انداز میں پرکھنے کے اصول متعین کیے گئے ہیں۔

مولوی نذیر احمد (1912-1833) سرسید کے تعلیمی منصوبے کے بڑے مبلغ تھے مگر ان کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھے۔وہ پہلے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے پھر ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔انھوں نے اپنی محنت اور مشقت سے انگریزی میں بھی اچھی خاصی اہلیت پیدا کر لی تھی۔ انھوں نے کئی قانونی کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں ''تعزیرات ہند'' اور ''قانون شہادت'' ان کے ترجمے کے شاہکار ہیں۔مگر جس چیز نے انھیں حیات جاوید عطا کر دی وہ ان کے ناول ''مرآۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' ہیں۔پہلا ناول انھوں نے اپنی لڑکی کی تعلیم کے لئے نصاب کی حیثیت سے تیار کیا تھا۔مرآۃ العروس اور بنات النعش دونوں میں انھوں نے لڑکیوں کے سلیقہ مند، ہنرمند اور تعلیم یافتہ بننے کی ترغیب دی ہے۔نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے رفقا میں مولانا شبلی نعمانی بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں وہ 1857 میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔وکالت کا امتحان پاس کر کے کچھ دنوں وہیں وکالت کی پھر علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔وہاں انھیں سرسید، حالی، محسن الملک اور پروفیسر آرنلڈ سے ملنے کا موقع ملا جس سے ان کے علم میں بہت وسعت پیدا ہوئی۔مولانا شبلی کی تصنیفات کی تعداد بہت ہیں مگر ''المامون''، ''الفاروق''، ''سیرت النبی''، ''علم الکلام''، ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' نے ان کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور آگے بھی زندہ رکھیں گی، ان کے مکاتیب اور مقالات بھی

مطالعے کی چیز ہیں۔شبلی کی زبان رواں، پر کیف اور رنگین ہوتی ہے۔شبلی نے اعظم گڈھ میں ایک بڑا ادارہ دارالمصنفین کے نام سے قائم کیا جو آج بھی بحسن وخوبی اپنا کام کر رہا ہے۔شبلی کا محض ستاون سال کی عمر میں 1914 میں انتقال ہوگیا۔

مولانا ذکاء اللہ نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں زیادہ تر تاریخ اور فلسفے سے تعلق رکھتی ہیں۔ محسن الملک نے بہت کم لکھا مگر جو کچھ لکھا بہت معیاری ہے۔مہدی افادی نے تھوڑے سے مضامین اور خطوط لکھے ہیں لیکن ان کا اسلوب اتنا دلکش اور رنگین ہے کہ کوئی بھی نثر کی تاریخ لکھنے والا انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔

نشاۃ ثانیہ کے اس دور نے بہت سے مصنفوں کو پیدا کیا اور بے شمار تخلیقات وجود میں آئیں لیکن یہاں سب کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

8.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے جانا کہ

- شاعری کی تعریف کیا ہے اور نثر کسے کہتے ہیں
- دونوں کے امتیازات کیا کیا ہیں اور دونوں کی شناخت کیا ہے
- شمالی ہند میں شاعری کے آغاز وارتقا سے واقفیت حاصل کی
- شمالی ہند میں نثر کے آغاز وارتقا سے بھی واقف ہوئے

8.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1- شعر اور نثر میں وجہ امتیاز کیا ہے؟

2- شمالی ہند کی پہلی دستیاب شعری تخلیق کون سی ہے؟

3- کربل کتھا کا مصنف کون ہے؟

4- سرسید کی پہلی نثری کتاب کون سی ہے؟

5- جدید دور کے تین شعرا کا نام بتائیے۔

8.8 سوالات کے جوابات

1- کلام موزوں شعر ہے اور کلام ناموزوں نثر۔

2- شمالی ہند کی پہلی دستیاب شعری تخلیق جس پر تمام نقاد متفق ہیں، افضل کی بکٹ کہانی ہے۔

3- فضل علی فضلی۔

4- سرسید کی پہلی تصنیف ''آثار الصنادید'' ہے۔

5- مولانا الطاف حسین حالی، چکبست، علامہ اقبال۔

8.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
شناخت	پہچان
امتیازات	امتیاز کی جمع، فرق کرنا، تمیز کرنا
اجمالی	جامع، پراگندہ کو اکٹھا کر دینا
مفرد	ایک، واحد
خواندہ	پڑھا لکھا
ناخواندہ	غیر پڑھا لکھا
موزوں	جس میں وزن اور بحر درست ہو
انحراف	انکار، پھر جانا
قدر مشترک	توقیر، مرتبہ، جو دو چیزوں میں شامل ہو
ایجاز	اختصار
لغوی	لغت کا
نواح	آس پاس
الحاق	ملانا، ملنا
تحریف	تبدیل کر دینا، بدل دینا
ایہام	شک میں ڈالنا۔ نام ایک صنعت شعر کا
انحطاط	کم ہونا، نیچے آنا۔

8.10 کتب برائے مطالعہ

احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1909

شمس الرحمان فاروقی — شعر، غیر شعر اور نثر — شب خوں کتاب گھر، الٰہ آباد، 1998

جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013
شہناز انجم	ادبی نثر کا ارتقا	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 1985
تبسم کاشمیری	اردو ادب کی تاریخ	سنگ میل پبلی کیشن، لاہور، 2003

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 9 دہلی میں اصلاحِ زبان کی کوشش

(ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک- مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات، دیوان زادہ کے دیباچہ کی تاریخی ولسانی اہمیت)

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 اصلاحِ زبان کی کوشش

9.4 ایہام گوئی اور ترک ایہام گوئی کی تحریک

9.5 مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات

9.6 دیوان زادہ کے دیباچہ کی تاریخی ولسانی اہمیت

9.7 آپ نے کیا سیکھا

9.8 اپنا امتحان خود لیجیے

9.9 سوالات کے جوابات

9.10 فرہنگ

9.11 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ

- اصلاحِ زبان کی تحریک کا کیا مقصد تھا
- ایہام گوئی کسے کہتے ہیں
- ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کے رجحان اور ان کے اسباب
- مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات
- ''دیوان زادہ'' کے دیباچہ کی تاریخی اور لسانی اہمیت کیا ہے

9.2 تمہید

کوئی بھی زبان ایک دم یا چند برسوں میں نہیں بن جاتی زبان کے بننے میں صدیاں لگ جاتی ہیں کوئی زبان اپنی ابتدائی شکل میں صاف ستھری نہیں ہوتی اس عمل میں بھی برسہا برس لگتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتدائی شکل کے نمونے پرانی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس زبان میں شعروادب لکھنے کی باقاعدہ شروعات دکن میں ہوئی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اس کا پہلا نقش ہے اس کے بعد سے ولی دکنی تک ہمارے شاعر وادیب اسی زبان میں تخلیقی کام انجام دیتے رہے۔

1700 میں جب ولی دکنی دہلی آئے اُس وقت دہلی میں فارسی کا چلن تھا۔ ولی کے اثر سے دہلی میں جب اردو شاعری کا نیا دور شروع ہوا تو یہاں کے شاعروں نے زبان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ وجہ یہ تھی کہ بہت سے مقامی الفاظ ان کے شعری مزاج سے ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے۔ شاعری میں بہترین الفاظ کا فنکارانہ استعمال ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا ان شاعروں نے شاعری میں عام طور پر استعمال کئے جانے والے کئی الفاظ کو غیر فصیح سمجھ کر ان کا استعمال ترک کر کے زبان کی اصلاح کی کوششیں شروع کیں۔ اسی دوران بہت سے شاعر ایہام گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ اس طرح ان کے ذریعے ایہام گوئی کی تحریک نے جنم لیا۔ کچھ عرصے بعد جب ایہام گوئی ابتذال کی طرف جانے لگی تو اسے ترک کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور اس طرح ترکِ ایہام گوئی کی تحریک کا آغاز ہوا۔

واضح رہے کہ ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک صرف 30 سال تک جاری رہی۔

9.3 اصلاحِ زبان کی کوشش

17 ویں صدی تک اردو زبان میں شعر وادب کی ایک مضبوط روایت قائم ہو چکی تھی اس عہد کو دکنی ادب کا دور کہا جاتا ہے اس زمانے میں اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے گذر رہی تھی عام لوگ جس زبان میں بات چیت کرتے تھے اسی زبان میں شاعری بھی کرنے لگے اس زبان میں مقامی بولی میں عام طور پر مستعمل بہت سے الفاظ شاعری میں بھی استعمال کیے جانے لگے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیے جن میں مقامی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں:

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا

محمد قلی قطب شاہ

دیدار دیکھ تیرا حیراں ہو رہیا ہوں
یک یک پلک تمھاری سورج مثال درپن

محمد امین ایاغی

گیا آرام سب تن کا پریشانی لگی نِس دِن
اچھلتے عشق کے شعلے کہوں کس جا مرن اپنا

حسن شوقی

پیا ایسے میں آئے تو گلے لگ کر گرم ہوؤں گی
کرم سے رب کے ہوؤں گی دو دانا دان ٹھنڈ کالا

سید میراں میاں خاں ہاشمی

پکڑے پہ دل الگ سوں نکو چپ بھواں کو تان
سپڑے شکار پر تو چڑائی کمان کیا؟
نصرتی

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتین کا پروتی ہار بیٹھوں گی
ہاشمی بیجاپوری

ان اشعار میں لائے جانے والے چند الفاظ جیسے پیا، باج، در پن، رہیا، سجن، مرن، آویں، بھار، سوں، موتین، ٹھنڈ کالا، سپڑے اور نس دِن وغیرہ الفاظ ایسے ہیں جو دکن میں عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں لیکن شمالی ہند بالخصوص دہلی میں ان کا اتنا چلن نہیں تھا یہاں کے لوگوں کا مزاج فارسی زبان کے الفاظ سے زیادہ آشنا تھا اس قسم کے الفاظ جن کا ذکر مثال کے طور پر کیا جا چکا ہے ان کے لیے نامانوس تھے وہ ایسے الفاظ کو گنوارو یعنی دیہاتی تصور کرتے تھے شاعری میں چونکہ بہترین الفاظ کا ہنر اور فنکارانہ استعمال مستحسن سمجھا جاتا ہے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال پسند نہیں کیا اور انھیں ترک کرنے کی کوششیں شروع کیں دراصل یہ ایک رجحان یا میلان تھا جس کے کچھ محرکات بھی تھے اسی وجہ سے ان کوششوں کو اصلاحِ زبان کی تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔

خان آرزو کو اصلاحِ زبان کی کوششوں کے سلسلے میں سب سے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ خان آرزو فارسی زبان و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا شمار لسانی تحقیق کے بنیاد گزاروں میں کیا جاتا ہے وہ پہلے فارسی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے کچھ عرصے بعد انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ فارسی گوئی کا دور آہستہ آہستہ ختم ہونے والا ہے اور مقامی زبان اُس کی جگہ لینے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس لئے انھوں نے فارسی کی بجائے ریختہ کی طرف خصوصی توجہ دی خان آرزو کے اثر سے کئی شاعروں نے فارسی گوئی ترک کر کے ریختہ میں شعر کہنے شروع کیے۔ انھوں نے دہلی میں ریختہ کے مشاعروں کو بھی رواج دیا۔ ریختہ گوئی کے فروغ میں خان آرزو کا بڑا حصہ رہا ہے انھوں نے نئی نسل کے شاعروں کی تربیت کی اور ان کے شعری ذوق کو سنوارا نکھارا۔ میر تقی میر، شاہ مبارک آبرو، ٹیک چند بہار، مصطفیٰ خاں یکرنگ اور شرف الدین مضمون جیسے شاعروں نے ان کی صحبت سے بہت فیض حاصل کیا۔

اصلاحِ زبان کے معاملے میں خان آرزو کی خدمات بہت اہم اور دور رس رہی ہیں۔ اردو کے لیے ہندوی، زبان دہلوی، ریختہ اور ہندی وغیرہ لفظ استعمال کیے جاتے تھے سب سے پہلے خان آرزو نے ہی اس زبان کو اردو نام سے موسوم کیا انھوں نے اردو زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی دوسرے انھوں نے اردو لغت نویسی کے خصوص میں اہم کام سرانجام دیا۔ خان آرزو نے نوجوان شاعروں کی سرپرستی اور تربیت کی اور فارسی کی بجائے اردو مشاعروں کی طرح ڈالی۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر

بات یہ ہے کہ بہت سے شاعر ایہام گوئی کی طرف راغب ہو گئے۔اس طرح اردو میں ایہام گوئی کی تحریک کا آغاز ہوا۔

9.4 ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کی تحریک

ایہام دراصل ایک شعری صنعت کو کہتے ہیں جس نے فارسی شاعری کے اثر سے اردو میں بھی رواج پایا۔ چند محقق اسے ہندی شاعری کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایہام کا لغوی معنی ''وہم میں ڈالنا'' ہے۔اصطلاحی معنی میں ''ایہام'' شاعری کی ایک ایسی صنعت کو کہا جاتا ہے جس کے تحت شعر میں ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس کے دو معنی ہوں۔ایک معنی قریب یا سامنے کا ہو اور دوسرا بعید یا دور کا ہو۔اس میں شاعر کی مراد بعید یعنی دور کے معنی سے ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ میر درد کا یہ شعر دیکھیے :

بستے ہیں تیرے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد انھیں سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

اس شعر میں لفظ ''سائے'' میں ایہام پایا جاتا ہے۔''سایہ'' چھاؤں کو کہتے ہیں۔ یہ دھوپ کی ضد ہے۔سایہ کے دوسرے معنی سرپرستی یا حمایت کے بھی ہیں۔اس شعر میں شاعر کی مراد دوسرے معنی سے ہے۔اب ایک اور مثال دیکھیے :

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اس گلی کے تنکے
رہتے ہیں ہم دوانے روزِ ازل سے تن کے

یہاں لفظ ''تنکے'' سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔تنکا سوکھی گھاس کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں اس کے یہی معنی ہیں۔دوسرے مصرعے میں اسی لفظ کو ''اُن کے'' معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

علم بدیع کی کتابوں میں ایہام کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔''ایہام مجردہ اور ایہام مرتشحہ'' ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔

ایہام گوئی کی تحریک کو فروغ دینے والوں میں خان آرزو کے علاوہ شاکر ناجی،شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون،شاہ حاتم اور مصطفٰے خاں یکرنگ وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ایہام گو شاعروں میں شاہ مبارک آبرؔو کا بڑا نام اور مقام ہے۔ایہام گوئی کے رجحان کو تحریک بنانے میں ان کا خاص حصہ رہا ہے۔جدت وندرت کی کمی ہونے کے باوجود ان کی شاعری میں روح عصر کا رفرما نظر آتی ہے۔ذو معنی الفاظ میں معنوی ربط پیدا کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے جو اشعار کی دل کشی میں اضافہ کرتا ہے۔نمونہ کلام:

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اُس گلی
ہوکرکے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

ایہام گوشاعروں میں شاکر ناجی بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ناجی کی کوئی غزل ایہام سے خالی نہیں ہر غزل میں ایہام کا نمونہ مل جاتا ہے۔ شاکر ناجی کے مزاج میں ایہام ایسا رچ بس گیا تھا کہ وہ ساری عمر اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ ان کی شاعری میں آمد کم اور آورد زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ شاکر ناجی کے یہاں تخلیقِ فن کی صلاحیتوں کی کمی تھی اسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے صنعتِ ایہام سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ان کی کوئی غزل ایہام سے خالی نہیں ملتی۔ نمونہ کلام:

محبت میں علی کی دیکھ ناجی
ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

شاہ ظہورالدین حاتم کے کمال شاعری کی قدر کرنے والوں میں عاشق، شاعر اور سپاہی زیادہ تھے اِس کا ذکر خود حاتم نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ حاتم پہلے فارسی میں شاعری کرتے تھے لیکن ولی دکنی کے اثر سے انھوں نے ریختہ گوئی کے میدان میں قدم رکھا اور تمام عمر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار اِس زبان میں کرتے رہے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے ان کا لسانی شعور پختہ تھا:

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

شرف الدین مضمون کا شمار ان معدودے چند شاعروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے ایہام گوئی کی تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔ ان کا شعری سرمایہ بہت زیادہ نہیں لیکن جو کلام ملتا ہے وہ اثر سے بھرپور اور معیاری ہے:

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو دل ڈوب جاتا ہے

مصطفیٰ خاں یکرنگ، آبرو اور مضمون کے ہم عصر تھے ان کی شاعری بھی اسی طرز و انداز کی حامل ہے۔ یکرنگ کی غزلوں کی جو خصوصیت سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کی تازگی اور سادگی ہے۔ انھیں سہل ممتنع سے خاص رغبت ہے اسی وجہ سے ان کی تمام غزلیں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں:

تجھ زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یکرنگ کا سخن میں خلاف ایک مو نہیں

اس دور کے دیگر ایہام گو شاعروں میں احسان اللہ احسان، ولی اللہ اشتیاق، سعادت علی امروہوی، عبدالوہاب یکروح اور میر محمد سجاد وغیرہ بھی اپنی گوناگوں خصوصیت کے باعث خاصی اہمیت کے حامل ہیں ان سب کے نام بھی ادبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ایہام گوئی کا میلان زبان و بیان کو وسعتیں دینے میں نہایت سازگار ثابت ہوا فارسی شاعری کے مقابل اردو شاعروں نے اپنے لئے مستقل جگہ بنائی ذو معنی لفظوں کی تلاش نے فارسی اور ہندی الفاظ کو برتنے کا سلیقہ پیدا کیا کچھ عرصے یہ سلسلہ جاری رہا پھر اُس میں یکسانیت پیدا ہونے لگی چند شاعروں نے اسے تفنن طبع کا ذریعہ بنالیا جس کی وجہ سے شاعری ابتذال کی طرف مائل ہونے لگی دوسری طرف بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات نے بھی شاعروں کے ذہن و دل کو متاثر کیا جس کی وجہ سے ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سب کے نتیجے میں شاعروں میں ایہام گوئی سے بیزاری کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ترکِ ایہام گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔

اس رجحان کے سب سے بڑے علمبردار مرزا مظہر جان جاناں تھے۔ جنھوں نے اصلاحِ زبان کے لئے باقاعدہ تحریک چلائی جس سے متاثر ہوکر شاہ حاتم اور دیگر شعرا اس تحریک میں شامل ہوگئے۔

ردِّعمل کی اس تحریک سے متاثر ہوکر شاہ حاتم نے بھی ایہام گوئی ترک کردی اور اپنا پہلا دیوان مسترد کردیا اس کے بعد انھوں نے دیوان زادہ عنوان سے اپنا ایک نیا دیوان مرتب کیا جس میں صنعتِ ایہام سے مکمل طور پر پہلوتہی کا رویہ ملتا ہے ردِّعمل کی اس تحریک میں جان جاناں کے بعد سب سے اہم نام شاہ حاتم کا ہی ہے ان کے علاوہ ایمان اللہ خاں یقین، عبدالحئ تاباں، محمد باقر حزیں، محمد فقیر دردمند اور اشرف علی خاں فغاں وغیرہ کو بھی ردِّعمل کی تحریکِ کے اہم شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ترکِ ایہام گوئی یا ردِّعمل کی اس تحریک کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔ اس تحریک نے ایہام گوئی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کا کام کیا۔

شاعری میں مقامی بولیوں کے ایسے الفاظ کا استعمال ترک کردیا گیا جو معیاری اور شعری زبان کے لیے ناموزوں تھے۔ دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی زبان جسے اردوئے معلیٰ کہا جاتا تھا کو معیار بنایا گیا۔

ریختہ اور فارسی کے تانے بانے سے معیاری شعری زبان کی تشکیل وتعمیر کی کوشش کی گئی۔

سادگی، شستگی اور تازہ گوئی پر خصوصی توجہ صرف کی گئی اور سخنِ بے تلاش پر بھی زور دیا گیا۔

اس تحریک کے زیر اثر اصلاحِ زبان کے لیے کچھ اصول اور قاعدے بھی مقرر کیے گئے جیسے:

ولی دکنی کی پیروی میں استعمال کیے جانے والے الفاظ ومحاورات سے گریز کیا جائے۔

شاعری کی زبان کو اردوئے معلیٰ میں ڈھالنے کی کوششیں کی جائیں۔ ایہام گوئی کو بالکل ترک کردیا جائے۔

ریختہ کے رنگ ومزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی تراکیب استعمال کی جائیں۔

فارسی شاعری جیسا طرز وانداز اختیار کرنے پر توجہ مرکوز کی جائے۔

اصلاح زبان کی تحریک کا اثر یہ ہوا کہ اُس نے ایک مختصر عرصے میں شاعری کا رخ سادہ گوئی کی طرف موڑ دیا۔

9.5 مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی خدمات

مرزا مظہر جانِ جاناں

خان آرزو نے ریختہ کے امکانات کو دیکھتے ہوئے اور مستقبل کو مدنظر رکھ کر ریختہ گوئی کے لیے عملی کوششیں کی تھیں جن کے خاطر خواہ نتیجے سامنے آئے اور فارسی شاعری کے چھتنار برگد تلے ریختہ کے پودے نے جڑ پکڑی اور ریختہ گوئی نے رواج پایا۔ چند برسوں کے بعد ریختہ گوئی میں ایہام گوئی کا رجحان ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا تو اس کی وجہ سے شاعری ابتذال کی شکار ہونے لگی تو اس کے ردِّعمل میں ایک نئی تحریک سامنے آئی یہ 18 ویں صدی کی دوسری ادبی تحریک تھی اس تحریک نے اردو شاعری کی کشتی کو گرداب سے نکال کر صحیح راستے پر ڈال دیا۔ ردِّعمل کی اس تحریک کی قیادت کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام مرزا مظہر جانِ جاناں کا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کی پیدائش وسط ہند کے علاقہ مالوہ میں ہوئی تھی۔ ان کی ساری عمر دہلی میں گذری اعلیٰ خاندان سے تعلق اور تعلیم وتربیت کی وجہ سے معیاری زبان انھیں وراثت میں ملی تھی۔ ان کے مزاج میں حد درجہ نفاست تھی ان کی گفتگو اور تحریر کی زبان میں زیادہ فرق نہ تھا۔ آبِ حیات میں جانِ جاناں اور انشاء اللہ خاں انشاء کی گفتگو کے چند فقرے نقل کیے گیے ہیں اس سے ان دونوں کی بول چال کی زبان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کو کم سنی سے ہی شاعری کا شوق تھا وہ کم عمری میں ہی مصرعے موزوں کرلیا کرتے تھے۔ جانِ جاناں خود کہا کرتے تھے کہ انھیں بچپن سے ہی حسنِ صورت اور لطف معنی کا شوق تھا۔ رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے شعر گوئی کا آغاز فارسی زبان سے کیا اور ایک طویل عرصے تک فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ ریختہ گوئی کی طرف بعد میں مائل ہوئے ان کے کلام کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ ریختہ کی بہ نسبت انھوں نے فارسی میں بہت زیادہ لکھا ہے 60 برس کی عمر تک فارسی میں 20 ہزار اشعار لکھ چکے تھے وہ بہت سُستہ فارسی لکھتے تھے اشعار میں عموماً عاشقانہ مضامین باندھا کرتے تھے جن میں عشق حقیقی کی جلوہ گری ملتی ہے۔ جانِ جاناں نے اپنے فارسی کلام میں سے ایک ہزار اشعار پر مشتمل ایک انتخاب خود تیار کیا تھا۔

جانِ جاناں نے ریختہ گو شاعروں میں نئے خیالات وجستجو کا جذبہ پیدا کیا انھیں کے اثر سے زبان ریختہ کی تطہیر عمل میں آئی۔ ہندی اور فارسی الفاظ کے تانے بانے سے ریختہ گوئی کی ترقی یافتہ شکل سامنے آئی۔

جانِ جاناں اپنا دیوان ریختہ مکمل نہیں کر سکے ان کا منتشر کلام بہت تلاش وتحقیق کے بعد 1961 میں یکجا کر کے عبدالرزاق قریشی نے مرتب اور شائع کیا ریختہ گوئی میں مرزا مظہر جانِ جاناں کا طرز وانداز اوروں سے بہت مختلف ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا نمونہ کلام:

گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
اتنی فرصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم
مدتو اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

مدت سے اس خیال کے آیا ہوں بیچ میں
گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں

الٰہی درد وغم کی سر زمین کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا جانِ جاناں کو آج اردو کے بڑے شاعروں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن شمالی ہندوستان میں ریختہ گوئی کے آغاز وارتقائی دور میں اپنی تخلیقی قوتوں کی بنیاد پر انھوں نے نہ صرف یہ کہ راہ ہموار کی بلکہ اپنے بعد آنے والوں کے لئے چراغ بھی روشن کیے۔ اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ میں ردِّعمل کی تحریک اور اصلاح زبان کی کوششوں کے سلسلے میں ان کی قابل قدر خدمات کا اعتراف اردو کی تمام ادبی تاریخوں میں ملتا ہے۔

شاہ ظہورالدین حاتم

ولی دکنی کے سفر دہلی کے بعد شمالی ہندوستان میں ریختہ گوئی یعنی اردو شاعری کا دور دورہ ہوا۔ شاہ حاتم اس دور کے ایک اہم شاعر ہیں انھوں نے ولی دکنی سے متاثر ہو کر اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ وہ ریختہ میں ولی کو اپنا استاد مانتے تھے۔ انھوں سے ولی کی بحروں میں کئی غزلیں لکھی ہیں۔ ولی کے بارے میں ان کا یہ شعر مشہور ہے:

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

شاہ حاتم دہلی میں پیدا ہوئے انھوں نے تیرہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی اُن دنوں فارسی گوئی کا عام رواج تھا۔ لہٰذا حاتم نے بھی فارسی میں لکھنے کی شروعات کی۔ پہلے رمزی تخلص کرتے تھے فارسی

زبان میں ان کا ایک دیوان ملتا ہے۔ ریختہ میں رمزی تخلص کے ساتھ ان کی کوئی غزل نہیں ملتی سب غزلوں میں حاتم تخلص ملتا ہے۔

شمالی ہندوستان میں ولی کی آمد اور پھر کچھ عرصے کے بعد ان کے دیوان کی آمد و مقبولیت نے دہلی کے شاعروں میں ریختہ گوئی کا شوق پیدا کیا۔ اس دور میں بول چال کی زبان کی حیثیت سے ریختہ کا چلن عام تھا۔ اس میں مقامی زبانوں کے الفاظ اور محاورات کثرت سے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس زبان میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت تو موجود تھی لیکن وہ سادگی، شستگی ،سلاست اور روانی نہیں تھی جو شعر گوئی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بعض الفاظ میں بھونڈا پن اور ناہمواری پائی جاتی تھی۔ یہ خرابی شعر میں حسن اور لطافت پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس وجہ سے ابتدا میں ریختہ گو شاعروں کو کمتر سمجھا گیا ان کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ لیکن حاتم اور ان کے چند ہم عصر شاعروں نے اپنی مسلسل کوششوں سے جلد ہی اس صورت کو تبدیل کر دیا۔ ریختہ گوئی کی پذیرائی عوام، خواص اور پھر ایوانِ شاہی تک ہونے لگی۔

شاہ حاتم نے کافی لمبی عمر پائی تھی انھوں نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً 75 برس شعر و ادب کی خدمت میں گذارے ریختہ گوئی میں خوب نام کمایا اور اسے بلند مرتبے تک پہنچایا۔

شاہ حاتم کی شاعری کے 2 دور مانے جاتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جس میں وہ ولی دکنی سے متاثر ہوئے۔ فارسی گوئی چھوڑ کر زبان ریختہ میں شعر کہنے لگے۔ دیوانِ ولی کا سب سے گہرا اثر انھیں کی غزلوں میں ملتا ہے۔ ایہام گوئی سے خصوصی رغبت بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ شاہ حاتم نے ایہام گوئی کے ابتدائی دور میں ہی اس تحریک سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک کے عروج کے زمانے میں بھی وہ اس سے منسلک رہے اور صنعت ایہام کو اپنے اشعار میں کامیابی کے ساتھ برتتے رہے۔ ایہام گوئی کا نمونہ:

نہ جانو دل بندھا تسبیح سرگرداں سے کس غم کے
کہ ہر دانا کے من کے بیچ ہیں سو راخ اس غم کے

مثال بحر موجیں مارتا ہے
لیا ہے جس نے اس جگ کا کنارا

ہے وہ چرخِ مثال سرگرداں
جس کو حاتم تلاشِ مال ہوا

حاتم بہت اچھا لسانی شعور رکھتے تھے۔ ایہام گوئی کو انھوں نے الفاظ کے خفتہ معنی اجاگر کرنے کا ذریعہ بنایا اور اس سے توسیع معنی کا کام لینے کی کوشش کی۔ کچھ عرصے کے بعد جب ایہام گوئی کی تحریک یکسانیت ابتذال اور زوال کی طرف مائل ہوئی تو شاہ حاتم نے ایہام گوئی یکسر ترک کر دی

اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے ساتھ اصلاحِ زبان کی کوشش کرنے لگے اور اخیر عمر تک یہی کرتے رہے۔ یہ ان کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔

شاہ حاتم کی سادہ گوئی کے نمونے:

کہتا ہے صاف وشُستہ سخن بس کہ ہے تلاش
حاتم کو اِس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

مظہر حق کی صنعت ریگِ بیاباں میں دیکھ
کہ ہر اک ذرہ میں خورشید نظر آتا ہے

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کبھی ہوتے ہیں پھر ہرے

نہ شب کو خواب نہ آرام دن کو یا قسمت
عجب طرح سے یہ لیل و نہار گزرے ہے

شمالی ہند میں ریختہ گوئی کے خصوص میں شاہ حاتم کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ وہ ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنھیں بے پناہ عزت ومقبولیت ملی۔ اس بات کا اظہار خود انھوں نے بھی کیا ہے:

تمام ہند میں دیوان کو ترے حاتم
رکھے ہے جان سے اپنی عزیز عام اور خاص

شاہ حاتم کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ حاتم کی ایہام گوئی ہو یا سادہ گوئی جذبات واحساسات کا فنکارانہ اظہار دونوں کا خاص وصف ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری کو ہر دور میں پسند کیا گیا اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

9.6 دیوان زادہ کے دیباچہ کی تاریخی اور لسانی اہمیت

اٹھارویں صدی کے اردو ادب میں دو ادبی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ پہلی ایہام گوئی کی تحریک دوسری ردِّ ایہام گوئی کی تحریک۔ دوسری تحریک کو اصلاح زبان کی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔

شاہ حاتم روش زمانہ کو قبول کرتے ہوئے ایہام گوئی کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے اس صنعت میں انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھائے ایک مختصر عرصے میں انھوں نے اپنا ایک ضخیم دیوان مرتب کرلیا۔ یہ حاتم کا پہلا دیوانِ ریختہ تھا۔ ادبی تاریخوں میں اسے ''دیوانِ قدیم'' نام سے

یاد کیا جاتا ہے۔اس دیوان کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

کچھ عرصے بعد مرزا مظہر جانِ جاناں کی قیادت میں ترکِ ایہام گوئی کا رجحان ابھرا۔اردو میں اصلاح زبان کی تحریک شروع ہوگئی۔شاہ حاتم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔انھوں نے اس نئی تحریک میں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔حاتم ایک پُر گو شاعر تھے۔ان کے مزاج میں وقت کے ساتھ خود کو بدلنے کی بھی بڑی صلاحیت تھی۔انھوں نے جلد ہی اس جدید رنگ میں بھی ایک نیا دیوان مرتب کرلیا۔اسے ''دیوان زادہ'' عنوان دیا۔اس دیوان میں کلام تازہ کے ساتھ ساتھ قدیم دیوان کے بہت سے اشعار بھی شامل ہیں جنھیں حاتم نے ضروری ترمیم کر کے نئے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔حاتم کے اس دیوان کا جنم کیونکہ دیوانِ قدیم کی کوکھ سے ہوا تھا اسی لیے انھوں نے اس کا نام ''دیوانِ زادہ'' رکھا۔حاتم کے یہ دو دیوان ایک مدت تک غلط فہمی کا سبب بھی بنے۔جمیل جالبی کے بقول برسوں تک یہ غلط فہمی رہی کہ قدیم دیوان کا مصنف تو شاہ حاتم ہے اور دیوان زادہ کا مصنف کوئی دوسرا شخص حاتم ثانی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ''دیوان زادہ'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس کی بڑی وجہ تازہ گوئی یا جدید رنگِ سخن کے علاوہ اس کا دیباچہ ہے۔شاہ حاتم نے یہ مختصر دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔

دیوانِ زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے خود اپنے بارے میں جو اہم باتیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

1۔ فنِ شاعری کو وہ اپنی عمر کے چالیس سال دے چکے ہیں۔لیکن ہنوز تربیت کے طالب ہیں۔ استاد کی ضرورت اب بھی محسوس ہوتی ہے۔

2۔ فارسی شاعری میں انھوں نے مرزا صائب کی پیروی کی ہے اور زبان ریختہ میں ولی دکنی کو استاد جانا ہے۔

3۔ اُن کا دیوانِ قدیم گذشتہ پچیس برسوں سے پورے ہندوستان میں مشہور اور مقبول ہے۔

4۔ ریختہ میں لکھتے وقت جو بھی خشک ونم نوکِ زبان پر آیا وہ انھوں نے بے کم وکاست قلم بند کر دیا۔ وہ سب دیوان قدیم میں داخل ہوگیا۔

5۔ انھوں نے دیوان زادہ میں اپنا قدیم اور جدید کلام یہ سوچ کر شامل کیا ہے کہ اُس کے ذریعے ان کے ماضی اور حال کے کام کی آگاہی ہو سکے۔

شاہ حاتم کے مطابق انھوں نے اپنے دیوانِ قدیم کی ہر ردیف میں سے دو غزلیں اور ہر غزل سے دو تین اشعار لے کر ایک بیاض بنائی اور اسے دیوانِ زادہ نام دیا۔اس میں شامل غزلوں کی بحروں کے وزن بھی تحریر کر دیے ہیں تا کہ مبتدی اس سے فیض حاصل کر سکیں۔

دیوان زادہ میں شامل غزلوں کو حاتم نے تین شقوں میں تقسیم کیا ہے۔انھیں طرحی، فرمائشی اور جوابی

عنوان دیے گئے ہیں۔اس طرح ان کا فرق معلوم ہوجاتا ہے۔منقبت، مرثیہ، مخمس اور مثنوی کو ان شقوں سے باہر رکھا گیا ہے۔

بقول شاہ مبارک آبرو:

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
اون سیتی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل وحرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے ریختے میں حرف ہے

شاہ حاتم بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دیوان قدیم سے اکثر الفاظ ترک کر دیے ہیں۔ان کی بجائے عربی اور فارسی کے بہ آسانی سمجھ میں آجانے والے الفاظ استعمال کیے ہیں۔دہلی کے روزمرّہ یعنی عام بول چال کے الفاظ ومحاورات ہر دیار کی ہندوی یعنی بھاکھا کو ترک کر دیا ہے۔اس کے صرف وہی الفاظ ومحاورات اختیار کیے ہیں جو عام فہم اور خاص پسند تھے۔

حاتم عربی وفارسی الفاظ کو صحتِ املا کے ساتھ لکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔وہ مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تسبیح کو تسبی، صحیح کو صحی بیگانے کو بگانہ اور دیوانے کو دوانہ لکھنا درست نہیں ہے۔اسی طرح عربی و فارسی الفاظ مثلاً مَرَض اور غَرَض وغیرہ کو مرض اور غرض باندھنا بھی غلط ہے۔وہ یہاں کی بجائے یاں اور وہاں کی بجائے واں کے استعمال کو شاعری کا عیب قرار دیتے ہیں۔شاہ حاتم سجن، من موہن نین، موا اور درس جیسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ایسے الفاظ جن میں حرف کی زیادتی ہے مثلاً سے کی بجائے سیتی اور کدھر کی بجائے کیدھر کے استعمال سے بھی منع کرتے ہیں۔حاتم کسی لفظ کے اخیر میں آنے والی ہائے ہوز کو الف سے تبدیل کرنے کے معاملے میں جمہور کی تابعداری کو اپنی مجبوری بتاتے ہیں۔وہ بندہ کو بندا اور پردہ کو پردا لکھنا درست قرار دیتے ہیں۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں شاہ حاتم نے شعری زبان کی اصلاح سے متعلق جو نکات بیان کیے ہیں ان کی خود حاتم نے بھی پیروی کی ہے۔مثال کے طور پر ذیل میں چند اشعار نقل کیے جارہے ہیں:

ہے عبث حاتم یہ سب مضمون و معنی کا تلاش
منہ سے جو نکلا سخن گو کے سو موزوں ہوگیا

لگا مت ہاتھ اس کی زلف کو اے بوالہوس ہرگز
کہ مشکل ہوگا ان کالوں کو بن منتر پڑھے چھونا

میں جاں بلب ہوں اے تقدیر تیرے ہاتھوں سے
کہ تیرے آگے مری کچھ نہ چل سکی تدبیر

مزا دنیا کا اپنی زندگانی تک ہے اے حاتم
جو ہم گزرے جہاں سے ہم نے جانا سب جہاں گزرا

ہمیں پوچھو تو ہستی اور عدم میں کیا تفاوت ہے
جہاں آیا کوئی اس بزم میں ہم ٹک سرک بیٹھے

ان اشعار کی زبان کا موازنہ اگر ولی اور ان کے ہم عصروں کی زبان سے کیا جائے یا خود شاہ حاتم کے دیوان قدیم سے کیا جائے تو واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ دیوان زادہ کے اشعار کی زبان دو صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آج کی اردو زبان سے مختلف نہیں معلوم ہوتی۔

شاہ حاتم خاتمۂ کلام اس بات پر کرتے ہیں کہ روزمرہ اور محاورے کی خلاف ورزی اور فصاحت میں نقص و خرابی شاعری کے لیے کسی طور درست نہیں۔ تاریخ ادب میں مذکور ہے کہ شاہ حاتم کا یہ دیباچہ ردِّعمل کی تحریک کے زیر اثر آنے والی تبدیلیوں کا منشور اور اپنی نوعیت کا منفرد اور اہم تاریخی دستاویز ہے۔

9.7 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے سیکھا کہ

- اصلاحِ زبان کی تحریک کا بنیادی مقصد کیا تھا
- ایہام گوئی کسے کہتے ہیں
- ایہام گوئی اور ترکِ ایہام گوئی کے اسباب کیا تھے
- مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم کی خدمات کیا تھیں
- دیوان زادہ کی تاریخی اور لسانی اہمیت کیا ہے

9.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ اصلاح زبان کی تحریک کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

2۔ ایہام گوئی کسے کہتے ہیں؟

3۔ ایہام گوئی کی تحریک کو کن شاعروں نے فروغ دیا؟

4۔ اصلاحِ زبان کی تحریک کا محرک کون مانا جاتا ہے؟

5۔ دیوانِ زادہ کے دیباچہ کی اہمیت کس وجہ سے ہے؟

9.9 سوالات کے جوابات

1۔ اصلاحِ زبان کی تحریک کا مقصد شعری زبان کو بہتر سے بہتر بنانا تھا۔

2۔ جب شعر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے دو معنی ہوں ایک معنی قریب کے اور دوسرے دور کے اور قاری کا ذہن قریب کے معنی کی طرف منتقل ہو جبکہ شاعر کا مراد دور کے معنی سے ہو، ایسی شاعری کو ایہام گوئی کہتے ہیں۔

3۔ ایہام گوئی کی تحریک کو شاہ مبارک آبرو، شاہ حاتم، شاکر ناجی، مضمون اور یک رنگ نے فروغ دیا۔

4۔ اصلاحِ زبان کی تحریک کے محرک مرزا مظہر جانِ جاناں تھے۔

5۔ دیوان زادہ کی اہمیت اُس کے دیباچے کی وجہ سے ہے جس میں ادبی اور لسانی امور پر شعرا کی راہ نمائی کی گئی ہے۔

9.10 فرہنگ

لفظ	معنی
اصلاح	درستی۔ترمیم۔تصحیح
ایہام	وہم میں ڈالنا
رجحان	توجہ، میلان
لسانی	زبان سے متعلق
ہم آہنگی	مناسبت
راغب	مائل
ابتذال	اخلاقی پستی، شاعری کا رکیک انداز
تشکیل	شکل بنانا، خاکہ بنانا
مستعمل	برتا ہوا۔استعمال کیے جانے والا
باج	بنا، بغیر
ٹھنڈکالا	سردی کا موسم
مستحسن	پسندیدہ، بہتر
میلان	رجحان

لفظ	معنی
محرکات	حرکت دینے والے۔اکسانے والے
ریختہ	اردو
دوررس	بلند خیال، دور تک پہنچنے والا
شعری صنعت	شعری ہنر
حمایت	طرف داری، محافظت
مژگاں	پلکیں
آمد	بلا تکلف مضمون ذہن میں آنا۔از خود خیال آنا
آورد	تکلف، بناوٹ
صدف	سیپ
سہل ممتنع	آسان الفاظ کا استعمال
گوناگوں	مختلف طرح کی
تفنن طبع	تفریحی مشغلہ، ہنسی دل لگی
اردوئے معلیٰ	دلّی کی اعلیٰ زبان جو قلعہ شاہی میں بولی جاتی تھی
شُستگی	صفائی۔صاف ستھرا پن
سلاست	کلام میں مشکل الفاظ نہ آنا
روانی	بہاؤ، تیزی
لیل ونہار	رات اور دن
تطہیر	پاک کرنا
الطاف	مہربانیاں، نوازشیں
بیاض	وہ کتاب جس میں اشعار لکھتے ہیں
مبتدی	ابتدا کرنے والا
بوالہوس	خواہشات کا مریض، لالچی
تفاوت	فاصلہ، فرق
منشور	فرمان، جماعتی اعلان

9.11 کتب برائے مطالعہ

محمد حسین آزاد	آبِ حیات مرتبہ ابرار عبدالسلام	شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان 2006
جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ اول)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ 1989
رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو (مرتبہ)	نول کشور پریس لکھنو؟، بارسوم
انور سدید	اردو ادب کی مختصر تاریخ	عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی 2014
انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	کتابی دنیا، دہلی۔2008
درسِ بلاغت	تالیف	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 2000
علم بدیع	مولوی رشید احمد	کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی 1952
شبلی نعمانی	شعرالعجم (حصہ چہارم)	دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ 1999
حسن احمد نظامی	شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ 1997
عبدالحق	شیخ ظہورالدین حاتم	اردو اکادمی دہلی 2013
محمد حسن	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	ادارہ تصنیف، ماڈل ٹاؤن، دہلی 1983
محی الدین قادری زور	سرگذشتِ حاتم	ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد 1966
شمیم طارق	مرزا جانِ جاناں مظہر	اردو اکادمی دہلی 2015
شیخ ظہورالدین حاتم	دیوان زادہ (مرتبہ عبدالحق)	نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، دلّی کتاب گھر دہلی 2011
غلام حسین ذوالفقار	شاہ حاتم: حالات وکلام	اورینٹل کالج لاہور۔1964

اکائی 10 لکھنو میں اصلاحِ زبان کا عمل: ناسخ اوران کے شاگردوں کی کاوشیں

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 لکھنو میں اصلاحِ زبان کا عمل: ناسخ اوران کے شاگردوں کی کاوشیں

10.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

10.3.2 ناسخ کا فن

10.3.3 ناسخ اوران کے شاگردوں کی اصلاحِ زبان کی کاوشیں

10.4 آپ نے کیا سیکھا

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالات کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- شیخ امام بخش ناسخ کے عہد اوران کے ہم عصروں کے متعلق جانکاری حاصل کریں گے
- شیخ امام بخش ناسخ کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے
- شیخ امام بخش ناسخ اوران کے شاگردوں کی اصلاحِ زبان کی کوششوں کی جانکاری حاصل کریں گے
- شیخ امام بخش ناسخ کے ہم عصر شعرا سے واقف ہوں گے

10.2 تمہید

دہلی کی تباہی اور بربادی کے بعد یہاں کی سیاسی ومعاشی انتشار سے پریشانی کے باعث مرکزِ علم وہنر لکھنو منتقل ہوگیا۔ میر، سودا، سوز و مصحفی سبھی نے دہلی کے سیاسی اور معاشی ہنگاموں سے پریشان ہوکر

لکھنو کا رخ کیا۔ یہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں تہذیب کا بول بالا ہوا، اس میں ترقی ہوئی اور ثقافتی روایات کی پاسداری میں کوئی کسر نہ رہی۔ لکھنو کے شعرا نے دہلی کی طرح تصوف پر تکیہ نہ کر کے شاعری کو نیم مذہبی تصوف اور مغموم داخلیت کے محدود دائروں سے نکال کر وسیع فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ لکھنو کے شعرا نے اپنی شاعری میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کی اور خارجیت، شادابی، شگفتگی اور زندہ دلی میں شاعری کو ڈبو دیا۔ معاملہ بندی اور ادا بندی کو ترقی ملی۔ مشکل قافیے اور دشوار زمینوں میں غزلیں کہہ کر ادبی عظمت اور شاعرانہ کمال کا مظاہرہ کیا گیا۔ لکھنو کے شعرا کی زبان ایک خاص ڈھانچے میں ڈھل گئی۔ اس عہد کے اہم تخلیق کار انشاؔء، جرأتؔ، آتشؔ اور ناسخؔ ہیں جن کی اصلاحات زبان اہم اور یادگار ادبی کارنامے ہیں۔ ناسخؔ نے تاریخ گوئی کو فروغ دے کر اسے غزل گوئی کے ایک جزو اور استادانہ مشاقی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ ناسخؔ کا اہم کارنامہ زبان و ادب سے متعلق ان کی اصلاحات ہیں۔ ان کی لسانی کاوشوں کو کافی سراہا گیا۔ ان اصلاحوں سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی اس کا حسن و بیان دوبالا ہو جاتا تھا۔ ناسخؔ کی ان اصلاحی کوششوں سے زبان میں شگفتگی، صفائی اور فصاحت کے عناصر کا اضافہ ہوا اور اس کا معیار قائم ہوا۔ دراصل مظہر جانِ جاناں اور ناسخؔ نے ہی اپنی اصلاحی کوششوں سے شعر و ادب کو بے راہ روی سے بچایا۔ اصلاحِ زبان سے متعلق ان کی عظیم خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بعد کے دور میں بھلے ہی ناسخؔ کی شاعری کو اہمیت نہیں دی گئی لیکن وہ اپنے وقت کے کامیاب صاحبِ طرز شاعر تھے جو معمولی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جیسے عظیم شاعر نے بھی ان کی شاعرانہ عظمت اور کمالات کا اعتراف کیا۔ بیسویں صدی کے معیار اور پسند کے مطابق ناسخؔ کے بیشتر کلام بے کیف، بے جان لفاظی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے تینوں دواوین کا بغور مطالعہ کرنے پر ہمیں بہترین اشعار کی اچھی خاصی تعداد ملتی ہے جس سے وہ غزل کے صفِ اول کے شاعر مانے جائیں۔ ناسخؔ کے چند اشعار پیش ہیں:

؎ تری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

؎ زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

؎ ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

؎ تو جو دم بھر نہ میرے پاس ہوا
جی مرا جینے سے اداس ہوا

10.3 لکھنو میں اصلاحِ زبان کا عمل: ناسخ اوران کے شاگردوں کی کاوشیں

10.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

ناسخ کا پورا نام شیخ امام بخش تھا۔ان کی ولادت فیض آباد میں اپریل، 1772 میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام خدا بخش تاجر لاہوری تھا۔ ناسخ کا تعلق ایک ایسے تجارت پیشہ خانوادے سے تھا جس کا کچھ عرصے تک فیض آباد میں قیام رہا اور بعد میں لکھنو میں آباد ہو گئے۔ناسخ بچپن میں ہی اپنے والدین کے ساتھ لکھنو آ گئے تھے۔ان کا انتقال 1838 میں ہوا تھا۔انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ انہیں پہلوانی اور ورزش کا بہت شوق تھا۔جوانی میں سپاہیانہ روش رکھی اسی لیے انہیں ''پہلوانِ سخن'' بھی کہا جاتا ہے۔ناسخ لکھنو کے محلّہ ٹکسال میں رہتے تھے۔حاجی وارث علی شاہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کیا ور بعد میں علمائے فرنگی محل سے درسی کتابیں پڑھیں۔ان کے دواوین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ انہیں عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔بچپن میں ہی ان کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ابتدا میں وہ اپنے ابتدائی مذہب کے پیروکار تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور شیعہ ہو گئے۔ناسخ نے نشیب و فراز، کشمکش اور ادبی معرکہ آرائی سے بھرپور زندگی گزاری جس میں رفیقوں، حلیفوں اور شاگردوں سے محبت اور مخالفوں سے عداوتیں ملتی رہیں۔

اپنی 48 سالہ ادبی زندگی میں ناسخ کسی استاد کے شاگرد نہیں بنے لیکن درجنوں شاگردوں کے استاد ضرور رہے۔انہوں نے فارسی اور اردو کے ممتاز شاعروں کے کلام سے فیض حاصل کیا تھا۔20 سال کی عمر میں جب ناسخ نے لکھنو میں شاعری شروع کی تو اس وقت سودا اور میر حسن کا انتقال ہو چکا تھا اور میر، مصحفی، انشاء، جرات، قتیل اور سوز وغیرہ موجود تھے۔ایسا کہتے ہیں کہ انہوں نے میر سے اپنے کلام پر اصلاح چاہی تھی لیکن میر نے انہیں اپنا شاگرد بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ابتدا میں ناسخ مشاعروں میں شامل ہوتے، سنتے اور سمجھتے۔اس طرح وہ مشاعروں کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ مشاعروں میں شامل ہونا اور کلام نہ پڑھنا ایک طرح کی احتیاط تھی۔انہوں نے سارے معرکوں کو طالب علمانہ طور پر دیکھا اور بہت کچھ سیکھا اور ساتھ میں اپنے ذہنی فضا کی تربیت بھی کی۔شعر و شاعری کی مشکل راہگزر سے واقفیت حاصل کی۔جب انشاء اور مصحفی کے معرکے کم ہوئے اور ان کی اپنی مشق بھی پوری ہوئی تو ان کے لیے زمین ہموار اور تیار تھی۔وہ میدانِ شاعری میں کود پڑے اور شہرت و ناموری میں زیادہ دیر نہیں لگی۔باوجود اس کے کہ انہوں نے اس سبزہ زار میں آنے میں کافی دیر کی بہت کم وقت میں استاد مان لیے گئے اور عہد ساز کہلائے۔

جب ہم ناسخ کے عہد کی بات کرتے ہیں تو یہ وہ دور ہے جب دہلی اجڑ چکی تھی اور وہاں کے شعرا پریشانیوں کے دور سے گذر رہے تھے۔اس کے برعکس ناسخ لکھنو میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ناسخ نے عہد آصفی سے عہد نصیری تک کی رعنائیاں دیکھیں جسے عیش و عشرت کا سنہری زمانہ مانا جاتا ہے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد تک زبان اور سماج پر دہلی کی روایتوں اور وہاں سے ہجرت کر کے آئے

ہوئے شاعروں کا واضح اثر تھا۔ان سے درباروں، دیوان خانوں اور مشاعروں کی رونق بھی تھی اور عزت بھی۔آصف الدولہ کے آخری دور میں لکھنو میں ایک نئی معاشرت کا خاکہ بننے لگا تھا اور اس میں رنگ آمیزی بھی ہونے لگی تھی۔اودھ نے اجڑے دیار کے مقیم کو پناہ دی تھی۔لیکن دہلی کے بڑے شعرا نے پورب کے لوگوں کو اپنے سے کم تر مانا۔اس سلسلے میں مصحفی اور میر کے اشعار پیش ہیں ؎

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی ہے ، زباں داں یہ کہاں ہیں
مصحفی

برسوں سے لکھنو میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز
میر

انشا اللہ خاں انشاء نے 'دریائے لطافت' میں جب دہلی اور لکھنو کا موازنہ کیا تو دہلی کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی۔

10.3.2 ناسخ کا فن

جب لکھنو اسکول کا ذکر آتا ہے تو آتش اور ناسخ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔لکھنو اسکول کی انفرادیت اور اہمیت انہیں دونوں شاعروں خاص کر ناسخ کی عطا کردہ ہیں۔انہیں ادبی ڈکٹیٹر بھی کہا گیا کیونکہ زبان کے معاملے میں ان کا سکہ لکھنو اور دہلی دونوں جگہ پر رائج ہوا۔انہوں نے شعر و شاعری کی دنیا میں ایک زمانے تک حکومت کی۔شیخ امام بخش ناسخ اپنے عہد کے بہت ہی مشہور شاعر تھے۔ناسخ کا شمار ان عہد ساز شعرا میں ہوتا ہے جن کی عہد آفریں خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔لکھنو کے ادبی مرکز کی تعمیر و تشکیل میں ناسخ کی تاریخی حیثیت ہے۔انہوں نے جب شاعری کا آغاز کیا اس وقت لکھنو میں دہلوی شعرا کا بول بالا تھا۔ناسخ کی شاعری نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تب لکھنو میں انشاء، مصحفی، جرات اور میر کی شاعری کا دور تھا۔ان سبھی شاعروں کا انداز الگ تھا۔مشترک تھا تو صرف یہ کہ سبھی دہلی سے تھے۔ان سبھی میں سب سے منفرد شخصیت اور شاعری میر تقی میر کی تھی۔ناسخ لکھنو کے سب سے پہلے اور اہم شاعر ہیں۔انہوں نے 20 سال کی عمر میں جب شاعری شروع کی تب سودا اور میر حسن وفات پا چکے تھے۔میر، مصحفی، انشاء، جرات، قتیل اور سوز جیسے شاعر موجود تھے۔اردو کے عظیم شعرا میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔وہ ہمارے ان تاریخ ساز شاعروں میں تھے جن کی عہد آفریں ادبی خدمات لکھنو کے ادبی مرکز کی تعمیر و تشکیل میں تاریخی حیثیت سے ناقابلِ فراموش ہیں۔ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ہی وہ بڑے زبان داں اور ماہرِ لسانیات بھی تھے۔انہوں نے ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی تھی جس نے دبستانی اسلوب کی

حیثیت سے فروغ پایا اور لمبے عرصے تک غزل پر اپنے نشانات نمایاں رکھے۔اس اسلوب سے غزل نے ایک نیا مزاج پایا تھا۔ان کی اصلاحِ زبان کی خدمات اتنی اہم ہیں کہ انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ناسخ کی شاعری نے کم عرصے میں اتنی شہرت حاصل کر لی کہ لکھنو کے سرکاری عہدے دار اور امرا ان کے شاگرد ہو گئے۔انہوں نے کبھی دربار سے رشتہ نہیں جوڑا۔انہوں نے ادبی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی درباری اور سیاسی زندگی کے نشیب وفراز بھی دیکھے۔کبھی سیاسی حالات سازگار رہوتے کبھی حالات کی ناسازگاری کا شکار ہو کر انہیں لکھنو سے فرار اختیار کرنا پڑتا۔

ناسخ کی تربیت میں ان محفلوں اور صحبتوں کا بہت دخل ہے جو شعروشاعری کے حوالے سے مرزا حاجی کے گھر پر منعقد ہوتی تھی۔مرزا حاجی کا نام قمرالدین احمد تھا اور وہ لکھنو کے اعلیٰ خاندان سے تھے۔ علوم وفنون میں ماہر تھے اور اہل ذوق کی محفلوں کی وجہ سے ان کا مکان ایک دبستان کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ناسخ نے انہیں محفلوں میں انشاء، مصحفی اور جرات جیسے باکمال شعراء کو دیکھا بھی، ان کے ہنگاموں کو سنا بھی اور مشاہدہ بھی کیا۔مرزا قتیل جیسے فارسی داں اور قاضی محمد صادق خاں اختر جیسے اہل ہنر بھی ان محفلوں کی رونق تھے۔شعروشاعری کے ساتھ ساتھ زبان کی تراش خراش اور تحقیق پر مباحثے بھی ہوتے تھے۔یہیں ناسخ کے شعروشاعری کے شوق کی پرورش ہوئی اور اسی صحبت نے ان کے اصلاحِ زبان کے ذوق وشوق کو پروان چڑھایا۔ناسخ کا شمار شخصیت اور شاعری دونوں اعتبار سے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنی ذاتی جد وجہد، حوصلہ اور حالات سے نبرد آزمائی کر کے خود ہی اپنے لیے ترقی کی شاہراہیں نکالتے ہیں۔ناسخ کے معاصرین میں آتش کے علاوہ قتیل، نواب محمد ترقی، نواب عاشور علی خاں، نواب نوازش علی خاں، مرزا خانی، کنور جسونت سنگھ پروانہ، مرزا حاجی قمر، انشاء اللہ خاں، غلام ہمدانی مصحفی، محمد عیسیٰ تنہا، میر خلیق، مرزا مغل سبقت، قلندر بخش جرات، طالب علی عیشی، محمد صادق اختر، مرزا مغل فانی اہم نام ہیں۔

10.3.3 ناسخ اوران کے شاگردوں کی اصلاحِ زبان کی کاوشیں

زبان کی ابتدا اور اس کی ترقی ایک فطری سماجی عمل ہے۔لیکن علمی اور ادبی زبان کے زیادہ تر حصے کی تکمیل ارادۃً ہوتی ہے۔اردو زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح اصلاح کے مسلسل عمل سے گزری ہے۔اس زبان کی وسعت چونکہ ملک کے ہر علاقے تک پہنچ چکی تھی اس لیے تہذیبی اور ثقافتی مراکز کے ردوبدل کے ساتھ سند کے معیار بھی بدلتے رہے اور ایک علاقے کی زبان دوسرے علاقے سے برتر سمجھی جانے لگی۔اہلِ علم نے اس لسانی کشمکش کو اصلاحِ زبان کی شکل میں پیش کیا۔دہلی والوں نے دکن کی زبان کے بیشتر حصے کو لچر مانا تو اہلِ لکھنو نے دہلی کے الفاظ کو روڑوں سے تعبیر کیا۔دہلی میں ولی کی آمد نے اردو کو نئی زندگی بخشی۔ان کے کلام کی مقبولیت نے بہت سے شعرا کو دیوان سازی اور ریختہ گوئی کی طرف متوجہ کیا۔ولی کے دہلی آمد کے بعد وہ دور بھی آیا جب یہاں کے شعراء نے لغات کی طرف توجہ کی جس میں خان آرزو کا نام سب سے اہم ہے۔اہلِ دہلی عربی فارسی زبان کی صحت کا

بہت خیال رکھتے تھے۔خان آرزو کے بعد مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم نے اردو کو ایک نیا رنگ وآہنگ دیا۔زبان کے ساتھ ہی اس کے فکری عناصر پر بھی زور دیا گیا۔اصلاحِ زبان کی ان تحریکوں نے اردو کو ایک معیاری زبان کی شکل عطا کی۔اس دور کے کچھ اور شعراء بھی اس تحریک سے جڑے تھے۔مثلاً انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، احسن اللہ بیانؔ وغیرہ۔حالانکہ خان آرزو، مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم کی اصلاحی کوششیں ان کے عہد میں قبول عام نہ ہوسکیں جیسی کہ ایک صدی بعد دہلی میں شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ اور لکھنو میں ناسخؔ اور آتشؔ کی اصلاحی کوششوں کو ملا۔

لکھنو میں مشاعروں اور شعروشاعری کا بازار گرم تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اصلاحِ زبان اور علمی تحقیق کا سلسلہ بھی ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا جس میں ناسخؔ کو خصوصی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اسی تحریک کی بدولت دلی کے مقابلے لکھنو ادب کا مرکز اور دبستان ہونے کا دعویدار تھا۔یہ بات اس لیے بھی درست تھی کیونکہ دہلی کی ساری انجمن لکھنو منتقل ہو چکی تھیں۔میرؔ، سوداؔ اور سوزؔ کو چھوڑ کر سبھی اہلِ کمال مرزا حاجی کی محفلوں میں اکٹھا ہو گئے۔ جہاں فن کے ساتھ اہلِ فن کی بھی خدمت ہوتی تھی۔ یہ سبھی شعروشاعری اور علمی مباحث کی محفلوں میں اکٹھا ہونے کے باوجود ہر ایک اپنے فن، ہنر اور کمال میں الگ تھا۔ یہاں تک کہ شاعری اور اس کا معیار، شعری لہجہ، رنگ روپ اور خاص کر شاعر کا مزاج اور شخصیت الگ جھلکتی تھی۔فن اور اس کے اظہار کے معاملے میں اپنی منفرد چھاپ کو مستند ثابت کرنے کی کوشش میں ہنگامے اور ادبی معرکے ہوئے۔جس کے نتیجے میں شاعری کی چھان پھٹک اور زبان کی تحقیق پر کام ہوتا رہا۔خوب سے خوب تر کی کوشش میں شاعری کے نئے نئے رنگ سامنے آئے۔اس نئی فضا نے لکھنو کو مرکزِ ادب بنانے کے ساتھ اس کو مستحکم اور مسلم کر دیا اور لکھنو کی بات مستند ہوئی۔ جسے مولانا آزادؔ نے ''لکھنو کی زبان اب دلی کے قید تقلید سے آزاد ہے'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔لکھنو اور طرزِ لکھنو اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ بھی اسے ''پسندیدہ'' اور ''منتخب'' مانتے ہیں۔حالانکہ سارا تانا بانا معنوی خوبیوں سے زیادہ لفظی حسن کے گرد ہی بنا جا رہا تھا۔جس سے صنائع بدائع کا استعمال بڑھنے کے ساتھ ساتھ مبالغے کی شدت، تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار، ذو معنی الفاظ، لفظی رعایتیں بھی عام ہوئیں اور ان کا استعمال جنون کی حد تک بڑھ گیا۔نتیجتاً بلند پایہ مضامین مشکل پسندی کی نظر ہوئے، عربی الفاظ کا استعمال بڑھا اور شعوری طور پر محاوروں اصطلاحات کو بدلا جانے لگا۔خصوصاً دہلی کے الفاظ اور محاوروں کے مقابلے میں۔اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ بعض الفاظ خوبصورت ہو گئے اور بعض کا روپ بدل گیا۔مگر کہیں کہیں یہ تبدیلی مضحکہ خیز بھی ہوگئی کیونکہ محاورے، الفاظ اور تذکیر وتانیث نئے سرے سے بدلے گئے۔لفظوں اور محاوروں تک تو یہ بات شاید زبان کو توسیع دینے کی کوشش رہی ہو۔تذکیر وتانیث میں بدلاؤ کرنا محض دلی والوں سے خود کو الگ بتانا یا تہذیبی سطحوں کو زبان کے نئے زاویے سے الگ کرنے کا جنون تھا اور اپنی برتری ثابت کرنے کی ضد بن گیا تھا۔یہ اس حد تک فائدے مند ثابت ہوا کہ متروکات کا استعمال کم ہوا اور زبان کی اصلاح ہوئی۔یعنی آئے ہے، جائے ہے، کہے ہے، لوں ہوں، دوں ہوں، کبھو، کسو وغیرہ کو آتا ہے، جاتا ہے، کہتا ہے، لیتا ہوں، دیتا ہوں، کبھی، کسی

میں بدل گیا۔

زبان کی اصلاح اور تراش خراش میں جو کردار ناسخ اوران کے شاگردوں نے نبھایا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ رشید حسن خاں ناسخ کے لسانی اصلاحات کے قائل نہیں ہیں لیکن اس تاریخی حقیقت سے وہ متفق ہیں کہ اصلاحِ زبان کے میدان میں ناسخ کے شاگردوں نے ضرور اہم کام انجام دیے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ تلامذۂ ناسخ نے اصلاحِ زبان، قواعد شاعری، متروکات اور تذکیر و تانیث کے باب میں جو کام سرانجام دیے ہیں ان میں نہ صرف ناسخ کی تربیت شامل تھی بلکہ یہ تمام کام لکھنؤ کی اس ادبی فضا میں ہوا جس کو ایک مستند ادبی مرکز بنانے کے کارنامے کا فخر ناسخ کو ہی حاصل تھا۔ کسی شہر میں ادبی اور لسانی اصلاحوں کی تحریکیں تبھی جنم لیتی ہیں جب وہ شہر ایک مستند ادبی مرکز تسلیم کیا جانے لگے۔ ناسخ کی ادبی خدمات کی بنیاد پر لکھنؤ اگر ایک مستند ادبی مرکز نہیں بنتا تو یہ شہر لسانی اور ادبی اصلاحات کی تحریکوں سے بھی محروم رہتا۔ لہٰذا لکھنؤ کے ادبی مرکز کے زیرِ سایہ پیدا ہونے والی لسانی اور ادبی تحریکوں میں ناسخ کے اثرات سے انکار کر دینا غلط ہے۔

ناسخ نے اصلاحِ زبان میں حشو و زوائد کو کم کیا اور زبان کا جھول دور کر کے اظہار کو بے ساختہ اور چست بنایا۔ اس سے زبان کا جمالیاتی حسن قائم ہوا اور وہ بہتر ہوئی۔ ناسخ نے غلط محاوروں کو بھی معتبر جان کر قبول کیا مگر فصاحت پر زیادہ زور دیا اور لغوی صحت کو پیشِ نظر رکھا۔ اور یہ کوشش بھی کہ دوسری زبان کے الفاظ دب نہ جائیں۔ کیوں کہ اردو ہر زبان کے الفاظ کے خمیر سے وجود میں آئی ہے اس لیے اس میں ہر لفظ اردو کا سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے۔ وہ الفاظ جو فارسی، عربی یا مقامی بولی کے ہوں گے اگر ان کے استعمال سے جمالیاتی احساس مجروح ہوتا ہے تو ناسخ کے نزدیک انہیں ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ وہ اردو کے صحیح مزاج داں تھے۔ ان کی کوششوں سے زبان میں وسعت آئی اور اسے نہ صرف لکھنؤ بلکہ دہلی میں بھی قبول کیا گیا۔ ناسخ کے ان کارناموں کو ان کے اپنے عہد کے علاوہ بعد میں بھی سراہا گیا۔ صغیر بلگرامی کے الفاظ میں:

> ''غالب سے ایک دن کچھ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا۔ فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا۔''

ناسخ اوران کے پیروکار کا زیادہ زور محاسن لفظی، رعایات اور متعلقات پر تھا جس سے بعض اوقات معنوی خوبیاں بھی مجروح ہو جاتی تھیں۔ ناسخ کے شاگردوں میں میر علی اوسط رشک، بحر، برق، تعشق اور آباد وغیرہ اہم نام ہیں۔ ناسخ اوران کے تلامذہ مشکل پسندی، شکوہ لفظی اور مبالغے میں بہت آگے نکل گئے۔ اس کے علاوہ ناسخ نے شعوری طور پر فارسی اثرات کو اپنی شاعری میں جگہ دیا۔ بسیار نویسی کے باوجود وہ فارسی شاعری سے متاثر رہے۔ اگر فارسی کے کسی شعر میں انہیں کوئی خیال پسند آ جاتا تو وہ اس کا ترجمہ کر لیتے۔

ناسخ اور ان کے تلامذہ نے زبان و بیان میں اصلاحات کی شدت کے ساتھ توسیع کی اور زبان کو ایک نئے قالب میں ڈھال دیا۔ جو اردو مصادر اصولاً درست ہوں انہیں پر مشتقات کی بنیاد رکھی جائے۔ اس لحاظ سے قبول سے قبولنا، نزم سے نرمانا متروکات میں شامل ہوں گے۔ اردو مصادر میں 'و' کا اضافہ غلط ہے۔ مثلاً آوٗنا، جاوٗنا، پیونا وغیرہ کی جگہ آنا، جانا، پینا۔ مرکب مصادر میں 'کر' کی تکرار نہ ہو۔ مثال کے طور پر انتظام کر کر آیا کی جگہ انتظام کر کے آیا۔ جمع موئنث کے ساتھ فعل یا صفت بصورت جمع یعنی نون یا الف کے استعمال نہ ہو۔ گھٹائیں متوالیاں، چوٹیں بچائیاں کی جگہ گھٹائیں متوالی اور چوٹیں بچائیں۔ حروف اشارہ اور اسمائے ضمائر میں واوٗ اور یائے کا استعمال جیسے کہ اودھر، ایدھر، جیدھر، کیدھر تحریر کرنا متروک ٹھہرا۔ ہندی کے ایسے الفاظ اور تراکیب جو اردو کا جزو فطری نہیں بنے ہیں اور جن کے استعمال سے اجنبیت اور ناہمواری کا احساس ہوتا ہے انہیں ترک کر کے یا تو ہندی کے موزوں الفاظ استعمال ہوں یا فارسی کے خوش آہنگ الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثال کے طور پر دیہی (بدن)، تکنا، ٹک، پاتی وغیرہ۔ اردو الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال ہوں، تلوار کو تروار لکھنا غلط ہے۔ دوسری زبان کے الفاظ اسی طرح استعمال ہوں جیسے وہ اپنی زبان میں ہوتے ہیں۔ ضرورتاً ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ فارسی کے مخفف استعمال ہونے والے اسماء کی جمع ان کی اصل شکل کی بنیاد پر ہوگی۔ شہہ کی جگہ شہوں، گنہ کی جگہ گنہوں کا استعمال غلط ہے۔ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جن میں تغیرات واقع ہو گئے ہیں اردو کے الفاظ سمجھے جائیں گے۔ نخوت عربی لفظ ہے لیکن نخوتوں اردو ہو جائے گا۔ فارسی مصادر کا استعمال نہ ہو۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ ویسے ہی استعمال نہ ہو۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت استعمال نہ ہو۔ فارسی کے ثقیل اور انجانی ترکیبوں کا استعمال نہ ہو۔ تذکیر و تانیث کے لیے سماعت و رواج کی بنیادوں پر قواعد وضوابط کی بنیاد ڈالی۔ حالانکہ ناسخ کے استعمال کیے گئے الفاظ کی تذکیر و تانیث میں ان کے بعد تغیرات ہوتے رہے مگر اب بھی زیادہ تر الفاظ کی تذکیر و تانیث ان کے فیصلوں کے مطابق ہے۔ جن الفاظ کے آخر میں 'ا' ہو اسے 'ے' یا 'ی' سے تبدیل نہیں کیا جائے مثلاً ذرا سے ذری، جدا سے جدی نہ ہو۔ اردو اور فارسی کے حروف اصلیہ نظم میں دبے نہیں۔ اردو کے وہ الفاظ جنہیں اضافی واوٗ کے ساتھ لکھا جاتا رہا ہے ان کا استعمال نہیں کرنا۔ مثلاً، اوتار، اوجلا، اوجڑا، اوترنا کی جگہ اتار، اجلا، اجڑا، اترنا۔

ناسخ نے پرانی سادہ گوئی کو منسوخ کر کے طرزِ نو کا آغاز کیا اور شہرت حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ مومن اور غالب بھی ان کی شاعری سے متاثر تھے۔ ناسخ کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے الفاظ کے نئے نئے تلازمے جن کی مدد سے وہ استعاروں کے نئے نئے پیکر تراشتے۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا

- شیخ امام بخش ناسخ کے عہد اور ان کے ہم عصروں کی جانکاری حاصل کی
- شیخ امام بخش ناسخ کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوئے

- شیخ امام بخش ناسخ اوران کے شاگردوں کی اصلاحِ زبان کی کوششوں کی جانکاری حاصل کی
- لکھنو اسکول کی انفرادیت اور خصوصیات کی جانکاری حاصل کی
- دہلی کے شعرا کی ہجرت اور لکھنو میں ان کے قیام کی تفصیلات کا مطالعہ کیا

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ شیخ امام بخش ناسخ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

2۔ ناسخ کے والد کا نام اور پیشہ کیا تھا؟

3۔ ناسخ کے ہم عصروں کے نام لکھیں۔

4۔ ناسخ کے شاگردوں کے نام لکھیں۔

5۔ ناسخ کے دو اشعار تحریر کریں۔

10.6 سوالات کے جوابات

1۔ شیخ امام بخش ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

2۔ ناسخ کے والد کا نام خدا بخش تاجر لاہوری تھا۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔

3۔ ناسخ کے معاصرین میں آتش کے علاوہ قتیل، نواب محمد ترقی، نواب عاشور علی خاں، نواب نوازش علی خاں، مرزا خانی، کنور جسونت سنگھ پروانہ، مرزا حاجی قمر، انشاء اللہ خاں، غلام ہمدانی مصحفی، محمد عیسیٰ تنہا، میر خلیق، مرزا مغل سبقت، قلندر بخش جرات، طالب علی عیشی، محمد صادق اختر، مرزا مغل فانی اہم نام ہیں۔

4۔ ناسخ کے شاگردوں میں میر علی اوسط رشک، بحر، برق، تعشق اور آباد وغیرہ اہم نام ہیں۔

5۔ ؎ زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

؎ تو جو دم بھر نہ میرے پاس ہوا
جی مرا جینے سے اداس ہوا

10.7 فرہنگ

لفظ	معنی
عہد	زمانہ، قسم

لفظ	معنی
اصلاح	درستی
کاوش	جستجو
تلامذہ	شاگرد
فصاحت	خوش بیانی
زندہ دلی	دل لگی
پیشہ	کام
تغیرات	تبدیلیاں
معتبر	بھروسے کے قابل
مجروح	زخمی
تحقیق	تفتیش
تحریک	رغیب
ساکن	بے حرکت، مقیم
متحرک	حرکت کرنے والا
انفرادی	ذاتی
مستند	معتبر
توسیع	بڑھانا
پیروکار	وکیل
رعایات	نرمی
مضحکہ خیز	ہنسی مذاق میں ڈالنے والی بات

10.8 کتب برائے مطالعہ

انتخاب غزلیاتِ ناسخ	کاظم علی خاں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، 2005
ناسخ تجزیہ وتقدیر	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی	اردو پبلشر نظیر آباد، لکھنو، 1975
اعجازِ ناسخ	ڈاکٹر احسن نشاط	مرکز ادب اردو، لکھنو، 1988
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کانسل برائے فروغ اردو زبان 1986، نئی دہلی
انتخابِ ناسخ	رشید حسن خاں	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1972

اکائی 11 اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب اور موجودہ صورتِ حال

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 زبان کی تعریف

11.4 اردو زبان کا آغاز اور مقبولیت کے اسباب

11.5 اردو زبان کی موجودہ صورتحال

11.6 آپ نے کیا سیکھا

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

11.8 سوالات کے جوابات

11.9 فرہنگ

11.10 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ

* زبان کسے کہتے اور کیسے تشکیل پاتی ہے
* اردو زبان کو ہندوستان میں کیسے قبولیت حاصل ہوئی
* اردو زبان کی موجودہ صورت حال کیا ہے

11.2 تمہید

اردو جدید ہندوستانی زبان میں سے ایک ہر دل عزیز زبان ہے جس کی پیدائش دو مختلف معاشرے، مذاہب اور کلچر کے اشتراک سے ہوئی۔ یہ شمال سے لے کر جنوب تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ادبا اور عام لوگ اپنے مافی الضمیر کو مؤثر طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ اس زبان کی خوبصورتی اس کے رسم الخط، تلفظ اور ادائیگی میں مضمر ہے۔ زبان کی سطح پر اردو زبان نے مادر وطن سے سفر کر کے عرب وعجم کے ساحل اور بستیوں سے گزر کر مغربی ممالک میں اپنا مستقل مسکن بنایا اور روز افزوں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی لیڈران اپنی تقریروں کو مؤثر بنانے کے لیے اکثر وبیشتر اردو کے اشعار اور ضرب المثل کا استعمال بخوبی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ زبان برصغیر سے باہر عرب وعجم، دیار مغرب، جاپان، جرمنی، ترکی، مصر وغیرہ میں نہ صرف بولی جاتی ہے بلکہ وہاں کے مقامی لوگ اس زبان میں ادب بھی لکھ رہے ہیں

اور بہت سے ممالک کے تعلیمی اداروں میں اردو زبان کا شعبہ بھی قائم ہے جہاں سے ہر سال کافی تعداد میں طلبا علم وآگہی سے ہم کنار ہوکر ڈگریاں حاصل کررہے ہیں۔ یہ زبان لنگوافرینکا کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔

11.3 زبان کی تعریف

دنیا کی کوئی بھی زبان کسی فرد واحد کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک معاشرتی اور سماجی ضرورت کی وجہ سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اِسے زبان کا روپ اختیار کرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں، تب جاکر یہ مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لائق ہوتی ہے۔ اردو کے مشہور محقق اور ماہر لسانیات نے زبان کی نہایت عمدہ تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتے نکلتے ہیں، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہوجاتا ہے اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی ہے۔''

زبان معلومات اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہے۔ کائنات کی ہر ذی روح ایک دوسرے سے تبادلہ کرتی ہے لیکن لفظ 'زبان' کا استعمال بالخصوص بنی نوع انسان کے ذریعے ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کے لیے ہوتا ہے۔ زبان کا تعلق انسانی معاشرے سے بے حد گہرا ہے۔ زبان کے توسط سے ہی انسانی ذہن کے ارتقا کا علم ہوتا ہے۔ زبان کی کئی قسمیں ہیں مثلاً مادری زبان، سرکاری زبان، دفتری زبان، قومی زبان، رابطے کی زبان، تحریری زبان، اشارتی زبان اور علامتی زبان وغیرہ۔ مختصر یہ کہ رابطے اور معلومات کے تبادلۂ خیالات میں استعمال ہونے والے الفاظ کے مجموعے کو زبان کہتے ہیں جو معاشرے اور ماحول کی ضروریات کے تحت معرض وجود میں آتی ہے۔ زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور یہ بولی سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں معیار ومنہاج کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک معیاری اور اعلیٰ زبان کے لیے فصاحت وبلاغت، شائستگی اور درستگی ضروری ہے۔ تبھی اس میں ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت ہوسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زبان معاشرے اور سماجی ضروریات کی وجہ سے وجود میں آتی ہے لیکن اس کا فروغ فطری ماحول میں بچے کی پیدائش، ماں اور بچے کے شب وروز کے تبادلۂ خیالات، اس کے سمجھنے اور سمجھانے سے ہوتا ہے۔ بچہ کبھی رو کر، کبھی اشارے سے اپنی بات ماں یا دوسروں تک پہنچاتا ہے اور دھیرے دھیرے وہ اپنے مافی الضمیر کو اشارے، کنایے، توتلی زبان اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعہ ادا کرنے لگتا ہے۔ اس طرح سے الفاظ جملے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور ان کی ادائیگی میں لطف وشائستگی پیدا ہوجاتی ہے جو بعد میں تحریری شکل اختیار کرلیتی ہے۔

ابتدا میں بچہ ماں کی گود اور خاندان کے افراد سے زبان بولنا، سیکھنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھتا ہے لیکن جب بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہ اساتذہ کی صحبت، کتابوں کے مطالعہ، زبان کے اصول وضوابط کی قرأت اور لسانی نکات کی سمجھ سے ادبی زبان کے معیاری اور اعلیٰ ہونے کی فہم پیدا کرتا

ہے۔اس طرح سے زبان مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ادبی ومعیاری زبان کے منصب تک پہنچ جاتی ہے۔

11.4 اردو زبان کا آغاز اور مقبولیت کے اسباب

برصغیر کی زبانوں میں اردو غالباً واحد زبان ہے جو اپنی ابتدا سے روز افزوں ترقی کے منازل طے کرتی جارہی ہے۔گرچہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے منظرنامے نے اس زبان کے لیے بہت سی دقتیں پیدا کیں اور سیاسی وسماجی سطح پر اسے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر اپنی گوناگوں لطافت، شیرینی، فطری کشش اور خوبیوں کی بنا پر یہ زبان خاص وعام دونوں میں یکساں طور سے مقبول ہے۔ابتدا میں اہل اقتدار کی کوتاہی اور اہلِ نظر کی تنگ نظری کی وجہ سے اسے اس لائق نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس میں مافی الضمیر ادا کیا جاسکے لیکن شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک عوام نے اسے ایسے گلے لگایا اور روزمرہ میں ایسے برتا کہ ایک زمانہ اس کا شیدائی ہوگیا نتیجہ دن بہ دن یہ زبان پھلتی پھولتی رہی اور آخر کار اہلِ نظر کو بھی اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک فاتح کی حیثیت سے ہوئی۔وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان اپنے ساتھ لائے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد دربار کی زبان فارسی قرار دیا۔مسلمانوں کی تہذیب اور زبان دونوں نے ہندوستانی بولیوں کو متاثر کیا۔ان میں اپ بھرنش سے نکلی ہوئی ایک زبان نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور اپنے دامن کو وسیع کرتے ہوئے عربی وفارسی کی تمام خوبیوں کو اپنے قلب میں جگہ دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی زبان کے طور پر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک بولی اور سمجھی جانے لگی اور اس میں تبادلۂ خیالات کیا جانے لگا۔اور دیکھتے دیکھتے تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تقاضوں کے توسط سے برصغیر کی اقوام کی مشترکہ اظہار وابلاغ کی زبان بن گئی۔ہندوستان کی مشترکہ زبان جسے ہم آج 'اردو' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اس کے لیے ہندوستان کی زمین ایسی ہموار اور زرخیز ثابت ہوئی کہ آج اس نے تناور درخت کی شکل اختیار کرلی اور جس کا دائرہ مزید وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔لیکن اس مقام تک پہنچنے اور قبولیت حاصل کرنے میں اسے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا اور جن نشیب وفراز کا سامنا کرنا پڑا اس کا مختصر سا خاکہ کچھ اس طرح ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ 'اردو' زبان کے طور پر ترقی کرتی رہی مگر ابھی فارسی کے مقابل کھڑی نہیں ہو پائی تھی۔کیونکہ اسے دربار کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔درباری زبان فارسی تھی۔امراء اور رؤسا اسی زبان میں گفتگو کرنا اور ادب تخلیق کرنا باعث افتخار سمجھتے تھے۔اردو کے معروف محقق جمیل جالبی اردو زبان کے فروغ کے اسباب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''انگریزی زبان نارمنوں (فرانسیسی) کے حملے اور فتوحات کے بعد تقریباً ڈھائی سو سال تک صرف بولی ٹھولی کی حیثیت میں عوام کی زبان بنی رہی۔یہی عمل اردو زبان کے ساتھ ہوا۔فارسی زبان کے تسلط اور رواج کے سامنے ویسے تو یہ زبان

سر اٹھا کر نہ چل سکی لیکن لسانی وتہذیبی اثرات کے دھارے اس زبان کے جسم میں نئے خون کا اضافہ اسی طرح کرتے رہے جس طرح نارمنوں کی فتوحات کے بعد فرانسیسی زبان کی لطافت اور اس کا مزاج انگریزی زبان کے خون میں برابر شامل ہوتا رہا اور اس میں رفتہ رفتہ صفائی وشستگی، روانی وقوت اور بیان کا حوصلہ بڑھتا رہا۔''

تاریخ ادب اردو، ص2، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1989

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب مغل حکومت کمزور پڑنے لگی تو دیسی ریاستوں نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ان ریاستوں کے حاکموں نے فارسی کے بجائے وہ زبان جو محمد بن تغلق کے ساتھ شمال سے دکن ساتھ گئی تھی اسے ادبی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اردو زبان کی تاریخ گواہ ہے کہ جو کام شمال کے شعرا وادبا سے نہ ہوسکا اسے دکن کے شعرا نے بخوبی انجام دیا۔ لہٰذا اردو زبان کی تمام اصناف کی ابتدا اول اول دکن میں ہوئی۔

اردو زبان نے فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ عوامی زبان میں اظہار کی قوت پیدا ہوگئی اور اس نے فارسی، عربی اور ترکی کی مستحکم روایت سے اپنے دامن کو مالا مال کر لیا۔ نتیجہ فارسی کی پیروی میں اس زبان نے بھی ادب تخلیق کرنا شروع کر دیا۔

اس زبان کو ابتدا میں ہندی، ہندوی، دکنی، گجری اور ریختہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ جس علاقے میں گئی وہاں اس علاقے کی مناسبت سے اسے نام دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علاقوں اور زبانوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس نے اپنی ایک انفرادیت قائم کر لی۔ اسی لیے کہا جاتا کہ یہ زبان برصغیر کی عظیم زبان ہے اور اس علاقے کی لنگوا فرینکا ہے۔

اردو زبان کے فروغ میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ وملتان کے تہذیبی ولسانی اثرات کے علاوہ کچھ اور واقعات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً:

- محمود غزنوی اور آل محمود نے سندھ اور ملتان پر لگ بھگ دوسو سال تک حکومت کی اور اس کا دائرہ دہلی اور اس کے نواح تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کی گئی جو سب کے لیے رابطے کی زبان ہو۔ یہی تہذیبی اور سیاسی ضرورت اردو زبان کی تشکیل وترویج میں معاون ومدد ثابت ہوئی۔
- دوسرا تاریخی واقعہ علاء الدین خلجی کی گجرات اور دکن پر فتح سے شروع ہوتا ہے جو سو سال تک قائم رہا۔ چنانچہ فتح کے بعد جو لوگ شمال سے جنوب گئے وہ اپنے ساتھ ایک ایسی زبان ساتھ لے گئے جو بازار کی زبان تھی۔ چنانچہ معاملات زندگی اور لین دین کے لیے اسی زبان کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا جس میں فارسی، عربی اور ترکی الفاظ بھی شامل تھے۔ یہ تبدیلی اردو زبان کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ مزید یہ کہ محمد بن تغلق کا دہلی کے بجائے دولت آباد کو

دارالسلطنت بنانا بھی معاون ثابت ہوا۔ اردو نے اپنا حلقہ وسیع کرنا شروع کیا اور بول چال کی حد سے گزر کر جب ادبی سطح پر استعمال ہونے لگی اور شاعروں اور صوفیوں نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں 'گجری' اور 'دکن' میں دکنی کے نام سے جانی گئی۔

محمد بن تغلق کی حکومت کمزور ہوئی تو وہاں کے امرا نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اپنی اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی۔ یہ واقعہ تہذیبی، سیاسی اور لسانی اعتبار سے اہم تھا۔ اس سے دکن سے گجرات تک ان تمام واقعات و عوامل نے اردو زبان کے پھلنے پھولنے میں سازگار ماحول قائم کیا۔

- علاءالدین خلجی اور محمد بن تغلق کے ساتھ جو صوفیا کرام گجرات اور دکن گئے وہ واپس نہیں آئے بلکہ وہیں رہ کر اسلام کی تبلیغ کرنے لگے اور انھوں نے دین کی تبلیغ کے لیے اسی زبان کو ذریعہ بنایا۔ اسی زبان میں ان کی تحریریں ملتی ہیں۔ چنانچہ سماع، موسیقی، شاعری اور درسِ اخلاق کے لیے یہی زبان استعمال کی جانے لگی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زبان جس کی پیدائش شمال میں ہوئی لیکن سیاسی، تہذیبی اور لسانی تقاضوں کے تحت اس نے شمال کے بجائے دکن میں ادبی زبان کا روپ بہت پہلے اختیار کیا۔ جمیل جالبی نے اس کے چار واضح اسباب بیان کیے ہیں۔ یعنی:

- دکن کا شمال سے آزاد ہو کر خودمختار حکومت قائم کرنا اور ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالنا جو سب کے لیے مشترک ہو۔ اسی لیے یہاں کے حکمرانوں نے تہذیب و زبان کی سطح پر دیسی عناصر کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور اسے فروغ دیا۔
- مشترکہ تہذیب کے لیے مشترکہ زبان کا ہونا لازمی ہے اس لیے اردو زبان ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے ابھری اور یہاں خوب ترقی کی۔
- مسلمانوں کا ترقی پذیر نظام خیال اور فکری توانائی اس زبان میں شامل ہو چکے تھے۔ لہٰذا یہ زبان ایک ترقی یافتہ زبان کی شکل میں تمام زبانوں کے الفاظ زندہ زبان کی طرح اپنے اندر تیزی سے جذب کر کے ان علاقوں کی زبانوں سے قریب تر ہو گئی۔
- شمالی ہند میں فارسی کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ فارسی میں ادب تخلیق کرنا قدر و منزلت کا سبب تھا۔ دکن میں شمال کے برخلاف اردو زبان کو دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ اردو زبان کے فروغ میں صوفیائے کرام نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے عوام تک رسائی کے لیے اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور اسے ادبی اور معیاری زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات اور شاعری اردو زبان کی مقبولیت کے ضامن ہیں۔

تاریخ زبان اردو، جمیل جالبی، ص 16، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1989

اردو زبان کی مقبولیت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب ولی اورنگ آبادی کا کلام اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں دکن سے شمالی ہند پہنچا۔ ولی کے زمانے تک یہ زبان پوری طرح مستحکم ہو چکی تھی اور اس میں ادب تخلیق کیا جانے لگا تھا۔ داستانیں، مرثیے اور مثنویاں لکھی جا چکی تھیں۔ قلی قطب شاہ جیسے باکمال شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ ولی اورنگ آبادی نے شمال اور جنوب کی زبان کی آمیزش سے ایک ایسا ادبی پیمانہ تراشا جو شمال والوں کے لیے باعث تقلید ثابت ہوا۔ یہاں کے شعرا کو لگا کہ آج جس زبان کو اظہار کے لیے ناکافی سمجھا جاتا تھا اس میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی بے حد گنجائش ہے۔ چنانچہ اس وقت کے بیشتر شعرا فارسی سے اردو زبان میں شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں اس زبان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نثر و نظم میں شعرا کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ جس میں میر تقی میر، میر درد، سودا، ذوق اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں تو آگے چل کر غالب، سرسید، حالی، محمد حسین آزاد، مومن، مصحفی، آزردہ اور داغ جیسے باکمال شاعر اور نثر نگار نے اس زبان کو اپنے علم و آگہی سے باوقار زبان کا رتبہ عطا کیا اور اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ عالمی ادب کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو سکے۔

یہ وہ دور تھا جب دربار کی سطح پر فارسی کمزور پڑنے لگی۔ شمالی ہند کی وہ زبان جو عوام کی زبان تھی اس کی رسائی دربار تک ہونے لگی اور اردوئے معلّٰی کا درجہ اختیار کر لیا۔ بادشاہ کی سرپرستی نے اسے مزید تقویت عطا کی۔ امرا اور رؤسا اس زبان میں اظہار خیال کرنے لگے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم عرصے میں اس زبان میں بیش بہا سرمایے کا اضافہ ہوا۔

اردو زبان کی مقبولیت کا راز میر اور غالب کے کلام میں بھی پوشیدہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے جتنا کلام میر اور غالب کا پڑھا جاتا ہے اتنا انیسویں صدی کے کسی شاعر کا کلام خاص و عام میں مقبول نہیں۔ میر تقی میر کے سہل ممتنع اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مشکل پسندی اور فکر انگیز کلام نے اردو زبان کے قاری کو غور و فکر کی دعوت دی۔ آج ہم یہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ زبان ہے جس نے میر اور غالب کو پیدا کیا تو دوسری طرف انیسویں صدی کے نصف اول میں علامہ اقبال جیسا آفاقی شاعر عطا کیا۔ جس نے اپنے کلام کے ذریعے فکر و خیال کی سطح پر اس زبان کو گویائی عطا کی جو اس سے پہلے مفقود تھی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف اول تک اردو زبان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ داغ دہلوی کے اس شعر سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو زبان و ادب کی مقبولیت میں اس وقت چار چاند لگ گیا جب ہندوستان میں 1936 میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، دین محمد تاثیر، محمود الظفر اور دیگر ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ادب کا معیار بدلنا ہوگا۔ یہ وقت اردو زبان کی مقبولیت کے اعتبار سے

نہایت ہی سازگار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زبان کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ بالخصوص اردو افسانہ اور ناول (فکشن) کے میدان میں اس زبان نے ایسے نامور ادیب پیدا کیے جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں سے اردو فکشن کو عالمی ادب کے معیار پر لا کھڑا کیا۔ جس میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

1947 میں آزادی ملنے اور پاکستان کی تشکیل کے بعد اردو زبان پر ایک ایسا عبوری دور آیا جب اسے گونا گوں پریشانیوں اور الزامات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو بلاتفریق مذہب وملت ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔ یہاں غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے اس زبان کے فروغ اور مقبولیت میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اسے اپنی زبان کہنے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہیں کی۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا واقعہ بے حد مشہور ہے۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار منشی پریم چند کے پوتے آلوک رائے نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ 'پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنی اور اپنے اجداد کی زبان کو 'اردو' کہنے میں کسی طرح کا تامل نہیں تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دستور ساز اسمبلی میں زبان کی بحث شباب پر تھی اور یہ طے ہونا تھا کہ دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں کن کن زبانوں کو شامل کیا جائے۔ پنڈت جی نے ڈرافٹ کمیٹی کے ایک رکن ایم۔ ستیہ نارائن سے کہا کہ وہ زبانوں کی ایک فہرست تیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی 12 زبانوں کی ایک فہرست تیار کر کے پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کی۔ پنڈت جی نے اس فہرست کو کمیٹی میں پیش کرنے سے پہلے اس میں ایک تیرہویں زبان 'اردو' کا اضافہ کیا۔ لہٰذا جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ 'اردو کس کی زبان ہے۔' تو پنڈت جی نے غصے میں کہا کہ ''یہ میری اور میرے باپ داداؤں کی زبان ہے۔ پنڈت جی کی اردو زبان سے حقیقی محبت کے نتیجے میں اردو کو آٹھویں شیڈول میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح سے اردو اپنے ہی گھر میں بیگانہ ہونے سے بچ گئی۔

یہاں محبِّ اردو تیج بہادر سپرو اور پنڈت آنند نرائن ملا کی اردو دوستی کا ذکر ناگزیر ہے۔ تیج بہادر سپرو نے 12 رفروری 1939 کو لکھنؤ میں 'یوم چکبست' کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: ''مجھے اردو زبان سے محبت ہے۔ میں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندوستان کی زبان۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اردو میری اور قومی زبان ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ 'میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوسکتا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ جتنا دعویٰ مسلمانوں کو اردو پر ہوسکتا ہے اتنا ہی ہندوؤں کو بھی ہونا چاہیے۔'' اس لیے اردو دراصل ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور اس اتحاد کی واحد یادگار ہے۔''

عرض حال، یادِ چکبست، بحوالہ، مرزا خلیل احمد بیگ

اردو کے معروف ادیب پنڈت آنند نرائن ملاّ نے اردو سے والہانہ وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا۔'' ایسے نہ جانے کتنے غیر مسلم ادیب وشاعر اور عام قاری ہیں جنھوں نے اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے بھی اور ذریعہ معاش کے لیے بھی۔

اردو زبان کی مقبولیت میں مشاعروں نے اہم رول ادا کیے ہیں۔ مشاعرہ ایک خالص ادبی اور تہذیبی ادارہ ہے۔ اردو شاعری میں دلوں کو چھو لینے والی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ سننے والا بے ساختہ داد دیتا ہے۔ اجتماعی مسائل کو اجاگر کرنے والے شعرا کے کلام پر سامعین سر دھننے لگتے ہیں۔ یہ اردو زبان کا خاصہ ہے کیونکہ سننے والوں کی اس طرح کی شرکت اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ شاعری انسان کا فطری اظہار ہے اور دنیا کے تمام علاقوں اور تمام زبانوں میں شاعری کہی جاتی ہے لیکن پڑھنے اور سننے کا ایسا سماں اور شوق کہیں اور نظر نہیں آتا۔ ہمارے معاشرے میں اردو داں کو عزت واحترام کے ساتھ دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری اور مشاعرے بے حد مقبول رہے ہیں۔ یہ صرف اردو زبان کی اپنی شیرینی کی وجہ سے ہے۔ اردو زبان کی فطری دلکشی سامعین کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

قومی خدمات مشاعرے کی شان رہے ہیں۔ اس نے قومی یکجہتی میں ماضی اور عہدِ حاضر میں اہم کردار ادا کیا ہے اور کر رہا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈران کی لمبی چوڑی تقاریر پر شاعر کا ایک شعر بھاری پڑتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کی تحریک میں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی شاعری عوام کے دلوں میں جوش وولولہ بھر دیا کرتی تھی۔ اردو زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مشاعرہ ہندو پاک سے نکل کر عرب وعجم، یورپ، شمالی امریکہ، کناڈا، جرمنی، آسٹریلیا جیسے ممالک تک پہنچ گیا ہے جہاں یہ بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔ وہاں پر مشاعروں کو ادبی ایونٹ کہا جاتا ہے۔ مشاعرے نے دنیا میں اپنے آپ کو زندہ رکھا ہوا ہے اور اردو زبان وتہذیب کے چراغ کو بھی روشن کر رکھا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جن لوگوں نے لندن کا سفر کیا ان میں سرسید اور مولانا مظہر الحق نے اپنے سفر کے دوران اردو کو کہاں کہاں بولتے سمجھتے پایا اس کا ذکر اپنے خطوط اور سفرنامے میں کیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان میں ایک ایسی طاقت پوشیدہ ہے جو نامساعد حالات میں بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنے وجود کو زندہ وتابندہ رکھ سکتی ہے۔

ڈیوڈ میتھو نے اپنے مضمون Urdu in India میں اس کی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر قبولیت عام کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں وہ طاقت ہے جس کے ذریعے یہ اپنی اہمیت کو تسلیم کروا سکتی ہے۔ ضرورت صرف سازگار ماحول کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'اردو یورپ کی سب سے اہم زبانوں میں سے ایک بن رہی ہے یا یہ کہ جب اسے مناسب مترجمین میسر آجائیں گے تو غالب اور اقبال فوراً آفاقی شہرت حاصل کر لیں

گے۔تاہم یہ خیال اچھا ہے کہ اردو کو سنجیدگی سے لیا جارہا ہے اسے صحیح معنوں میں اپنے آبائی گھر سے بہت دور زندہ رکھا جارہا ہے۔اس بات کا سہرا اردو بولنے والی کمیونٹی کو جاتا ہے جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر بڑے پیمانے پر وقت نکال رہی ہے۔' یہی نہیں ڈیوڈ میتھو نے مدراس کے سفر کے دوران ایک ہوٹل کے ویٹر کی اردو زبان سے دلچسپی کا واقعہ بے حد دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے جس سے اس زبان کی مقبولیت عام کا اندازہ ہوتا ہے۔''میں نے اسے اردو میں مخاطب کیا اور اس کا نام دریافت کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کرشنا کچھ بے سکونی محسوس کررہا ہے۔لیکن نرم خوئی کے ساتھ گفتگو کے بعد اس میں پُر اعتمادی پیدا ہوگئی اور اس نے مجھ سے کہا۔''صاحب یہ 'سنائے' ہے۔ یہاں ہام تامل بولتا ہے۔ہمی ہندی پسند ناہی ہے۔''

میں نے فوراً جواب دیا''کرشنا جی میں تو ہندی نہیں بول رہا یہ تو اردو زبان ہے۔کرشنا کا چہرہ موہوم سی مسکراہٹ سے چمک اٹھا! اچھا صاحب! اردو بوہوت میٹھا بھاشا ہے۔ مجھے اس کا گجل بوہوت پسند ہے۔خاص طور پر وہ 'تو نہیں والا' اس کا اشارہ فلم 'بوبی' کے گانے 'میں شاعر تو نہیں' کی طرف تھا۔ آخر کار اردو نے مدراس میں ایک شخص کو حلقہ بگوش اردو تو کر ہی لیا۔''

اردو زبان کے فروغ میں ہندوستان کی فلموں نے کلیدی رول ادا کیے ہیں۔آج جسے ہم ہندی فلم کہتے ہیں وہ دراصل اردو فلمیں ہوتی ہیں کیونکہ ان کے مکالمے اور نغمے اور ڈائیلاگ جب سنتے ہیں تو وہ خالص اردو کے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بیشتر نغمہ نگار، اسکرپٹ رائٹر اور کہانی لکھنے والے اردو کے مشہور و معروف شاعر و ادیب رہے ہیں۔جن میں سرفہرست عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، گلزار، جاوید اختر، سلیم جاوید، کیفی اعظمی، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، نوشاد، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اور شہر یار کے نام خاص طور سے لیے جاتے ہیں جن کی بدولت اردو زبان گھر گھر پہنچ گئی اور سامعین اور ناظرین اس کے ایسے دلدادہ ہوگئے کہ آج ہر زبان پر اردو کے گیت اور ڈائیلاگ جاری و ساری ہیں۔

11.5 اردو زبان کی موجودہ صورت حال

اردو برصغیر کی مشترکہ زبان ہے۔ یہ زبان جذبات و احساسات، روحانی اور رومانی خیالات اور تاثرات کو بیان کرنے اور زندگی کی خوشی و غم کے اظہار میں کافی چاق و چوبند ہے نیز انسانی رشتوں کی وسعت، علمی خزانے اور افکار کا مسکن ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک تہذیب و ثقافت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر جنوبی ایشیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے یہ زیادہ پذیرائی حاصل کررہی ہے۔ ہندو پاک میں اسے سرکاری پذیرائی بھی حاصل ہے۔ بالخصوص بین الاقوامی سطح پر برطانیہ میں جہاں کے سرکاری عہدے دار اس بات کو مانتے ہیں کہ یہ قومی تعلیم کا اہم جزو بن چکی ہے۔

اردو زبان ایک عظیم اور ادبی ذخیرے کی زبان ہے جو برصغیر کی دیگر زبانوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

آج اردو گلوبلائزیشن کے دور میں اپنے گھر سے نکل کر مختلف شکلوں میں پھل پھول رہی ہے۔ اردو زبان کو عوام الناس میں مقبول کرنے میں مشاعروں کے علاوہ کلچرل پروگرام، ادبی ایونٹ مثلاً جشن ریختہ اور جشن ادب، جشن بہار اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ریختہ فاؤنڈیشن نے اردو کو روایتی طریقے سے ہٹ کر ایک نئے طریقے سے عوام کے درمیان متعارف کرایا جس کا اثر غیر اردو داں طبقے کی کثیر تعداد میں شرکت کے روپ میں نظر آ رہا ہے۔ یہی نہیں داستان گوئی، چہار بیت، قوالی، تمثیلی مشاعرے جو قصۂ پارینہ بنتے جا رہے تھے اسے ریختہ فاؤنڈیشن، جشن ادب، اردو اکادمی دہلی اور دیگر سرکاری اور نیم سرکاری تنظیمیں نئی شکل میں پیش کر کے اردو کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر رہی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم میں درس وتدریس کی سطح پر یونیورسٹیوں میں اردو متعارف ہو رہی ہے اور روز افزوں نئے شعبے قائم ہو رہے ہیں جس سے روزگار کے دروازے بھی وا ہوئے ہیں۔

ہندوستان ایک کثیر زبان بولنے والا ملک ہے۔ بہت سی زبانوں کا اپنا مخصوص علاقہ ہے لیکن اردو ایک ایسی زبان ہے جس کا اپنا کوئی خاص علاقہ نہیں ہے۔ یہ اپنے گھر سے نکل کر ملک گیر سطح پر اپنی شناخت اور دائرے کو روز افزوں وسیع کرتی جا رہی ہے۔ کچھ ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کا مزاج ایک سیکولر زبان کا ہے۔ اردو کا ماضی اور حال اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ بلاتفریق مذہب وملت ایک مضبوط رابطے کی زبان بنتی جا رہی ہے۔ یہ زبان اپنی تہذیبی وراثت کے ساتھ اپنی مستند روایت کو آگے بڑھانے میں کوشاں ہے۔ لہٰذا ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو نے جس طرح سے اپنے دائرے کو وسیع کیا ہے اسے بنیاد بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو کی موجودہ صورتحال مایوس کن نہیں ہے۔ اس زبان میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو اپنے آپ کو نامساعد حالات میں بھی قائم ودائم رکھ سکتی ہے۔

11.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے سیکھا کہ

- زبان کسے کہتے ہیں اور کیسے تشکیل پاتی ہے
- اردو زبان کی ابتدا شمالی اور جنوبی ہند میں کیسے ہوئی
- اردو زبان کی مقبولیت/فروغ کے کیا اسباب رہے ہیں
- اردو کی موجودہ صورت حال کیا ہے اور کس طرح سے یہ اپنے آپ کو عوامی سطح پر نئی شکل میں پیش کر رہی ہے۔

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ زبان کسے کہتے ہیں؟

2۔ اردو زبان کا آغاز کیسے ہوا؟

3۔ اردو زبان کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟

4۔ جنوبی ہند میں اردو کی مقبولیت/فروغ کے اسباب کیا تھے؟

5۔ اردو زبان کی موجودہ صورت حال کیا ہے؟

11.8 سوالات کے جوابات

1۔ زبان معلومات اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہے۔

2۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک فاتح کی حیثیت سے ہوئی۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان اپنے ساتھ لائے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد دربار کی زبان فارسی قرار دیا۔ مسلمانوں کی تہذیب اور زبان دونوں نے ہندوستانی بولیوں کو متاثر کیا۔ ان میں اپ بھرنش سے نکلی ہوئی ایک زبان نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور اپنے دامن کو وسیع کرتے ہوئے عربی و فارسی کی تمام خوبیوں کو اپنے قلب میں جگہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی زبان کے طور پر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک بولی اور سمجھی جانے لگی اور اس میں تبادلۂ خیالات کیا جانے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تقاضوں کے توسط سے برصغیر کی اقوام کی مشترکہ اظہار و ابلاغ کی زبان بن گئی۔ ہندوستان کی اسی مشترکہ زبان کو ہم آج 'اردو' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

3۔ اپنی گوناگوں لطافت، شیرینی، فطری کشش اور خوبیوں کی بنا پر یہ زبان خاص و عام دونوں میں یکساں طور سے مقبول ہے۔

4۔ علاء الدین خلجی کی گجرات اور دکن پر فتح کے بعد جو لوگ شمال سے جنوب گئے وہ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر گئے جو بازار کی زبان تھی۔ چنانچہ معاملات زندگی اور لین دین کے لیے اسی زبان کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا جس میں فارسی، عربی اور ترکی الفاظ بھی شامل تھے۔ یہ تبدیلی اردو زبان کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ مزید یہ کہ محمد بن تغلق کا دہلی کے بجائے دولت آباد کو دارالسلطنت بنانا بھی معاون ثابت ہوا۔ اردو نے اپنا حلقہ وسیع کرنا شروع کیا اور بول چال کی حد سے گزر کر جب ادبی سطح پر استعمال ہونے لگی اور شاعروں اور صوفیوں نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں 'گجری' اور 'دکن' میں دکنی کے نام سے جانی گئی۔

محمد بن تغلق کی حکومت کمزور ہوئی تو وہاں کے امرا نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اپنی اپنی خودمختار

حکومت قائم کر لی۔ یہ واقعہ تہذیبی، سیاسی اور لسانی اعتبار سے اہم تھا۔اس سے دکن سے گجرات تک ان تمام واقعات وعوامل نے اردو زبان کے پھلنے پھولنے میں سازگار ماحول قائم کیا۔

5۔ اردو زبان ایک عظیم اور ادبی ذخیرے کی زبان ہے جو برصغیر کی دیگر زبانوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔آج اردو گلوبلائزیشن کے دور میں اپنے گھر سے نکل کر مختلف شکلوں میں پھل پھول رہی ہے۔اردو زبان کو عوام الناس میں مقبول کرنے میں مشاعروں کے علاوہ کلچرل پروگرام، ادبی ایونٹ مثلاً جشن ریختہ اور جشن ادب، جشن بہار اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ریختہ فاؤنڈیشن نے اردو کو روایتی طریقے سے ہٹ کر ایک نئے طریقے سے عوام کے درمیان متعارف کرایا جس کا اثر غیر اردو داں طبقے کی کثیر تعداد میں شرکت کے روپ میں نظر آ رہا ہے۔یہی نہیں داستان گوئی، چہار بیت، قوالی، تمثیلی مشاعرے جو قصۂ پارینہ بنتے جا رہے تھے اسے ریختہ فاؤنڈیشن، جشن ادب، اردو اکادمی دہلی اور دیگر سرکاری اور نیم سرکاری تنظیمیں نئی شکل میں پیش کر کے اردو کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر رہی ہیں۔اعلیٰ تعلیم میں درس وتدریس کی سطح پر یونیورسٹیوں میں اردو متعارف ہو رہی ہے اور روز افزوں نئے شعبے قائم ہو رہے ہیں جس سے روزگار کے دروازے بھی وا ہوئے ہیں۔

11.9 فرہنگ

لفظ	معنی
مافی الضمیر	دل کی بات
مضمر	پوشیدہ، چھپا ہوا
مسکن	رہنے کی جگہ، قیام گاہ
ضرب المثل	کہاوت، قول
علم وآگہی	کسی بات کی تہ میں پہنچنا
لنگوا فرینکا	روزمرہ ترسیل کی زبان
معرض	اظہار کی جگہ
فصاحت	کلام میں سادہ الفاظ کا استعمال، خوش گوئی
بلاغت	برمحل گفتگو
برصغیر	جنوبی ایشیا/ ہندو پاک
اہل نظر	نظر والے

لفظ	معنی
اپ بھرنش	بگڑی ہوئی زبان، جدید ہند آریائی زبان سے پہلے شمالی ہند کی بول چال اور تخلیق ادب کی اہم زبان
نارمن	فرانسیسی
سماع	روحانی محفل، سننا
ملفوظات	اولیاء کرام کی زبان سے نکلی ہوئی بات/اقوال
راغب	مائل، خواہش
اردوئے معلیٰ	قلعے کی زبان
سہل ممتنع	وہ کلام جو بظاہر آسان ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہو
حلقہ بگوش	فرماں بردار
قصۂ پارینہ	قدیم کہانی / پرانی باتیں

11.10 کتب برائے مطالعہ

تاریخ ادب اردو جلد اول	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1989
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	این سی پی یو ایل، دہلی، 1997
ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی	مرزا خلیل احمد بیگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007
زبان کیا ہے؟	خلیل صدیقی	بیکن بکس، ملتان، 1989
اردو کی ابتدا میں صوفیا کرام کا کام	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1995
Urdu in India	ترجمہ: ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی	
ہندوستان میں اردو کی صورتحال		اردو ریسرچ جرنل، شمارہ 5، اپریل 2015